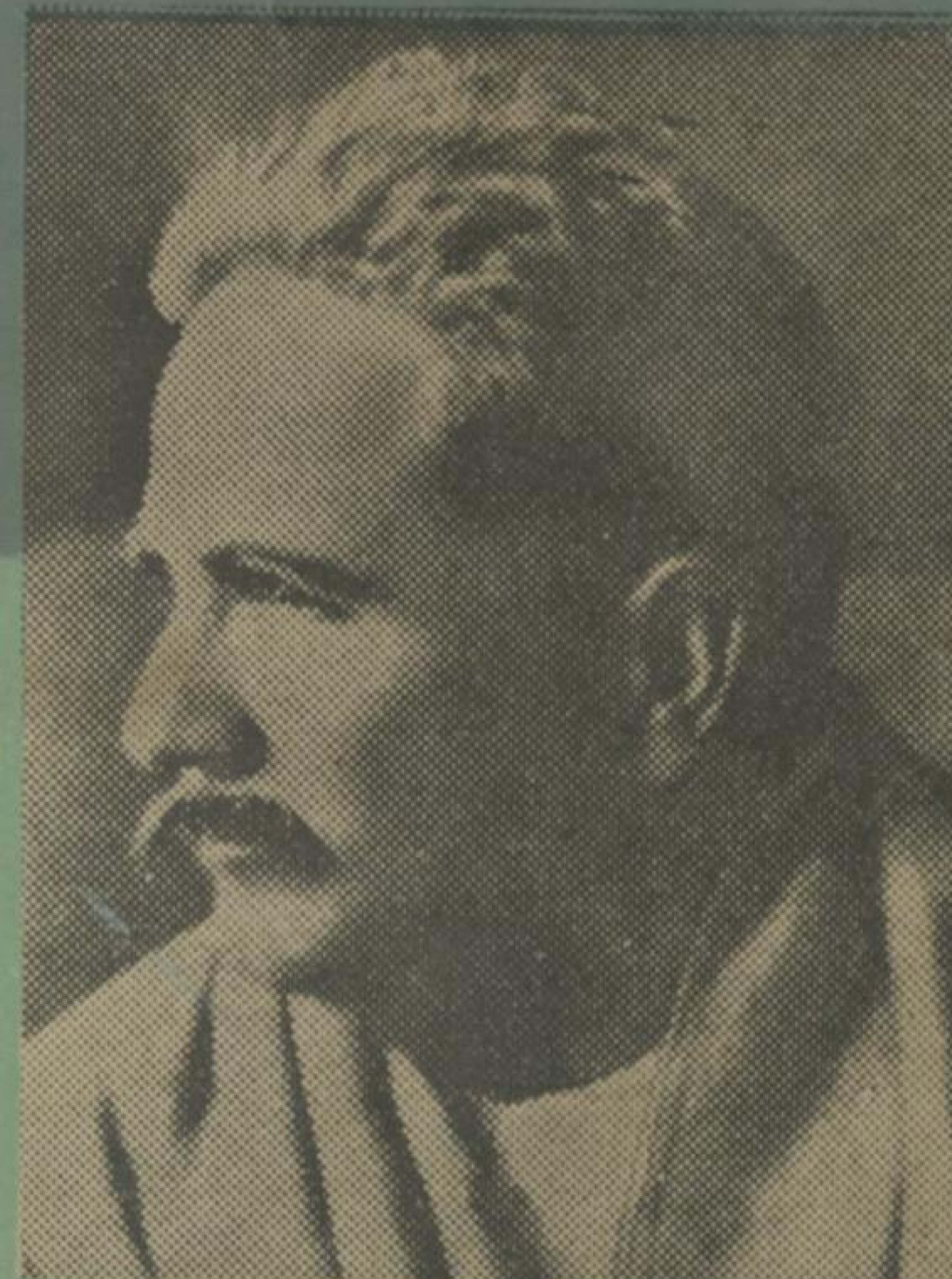


سراپردۂ افلاک

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

سراپردۂ افلاک

صُوفی غلام مُصطفٰے تبسُّم

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ مُحمّد اقبالؒ

ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

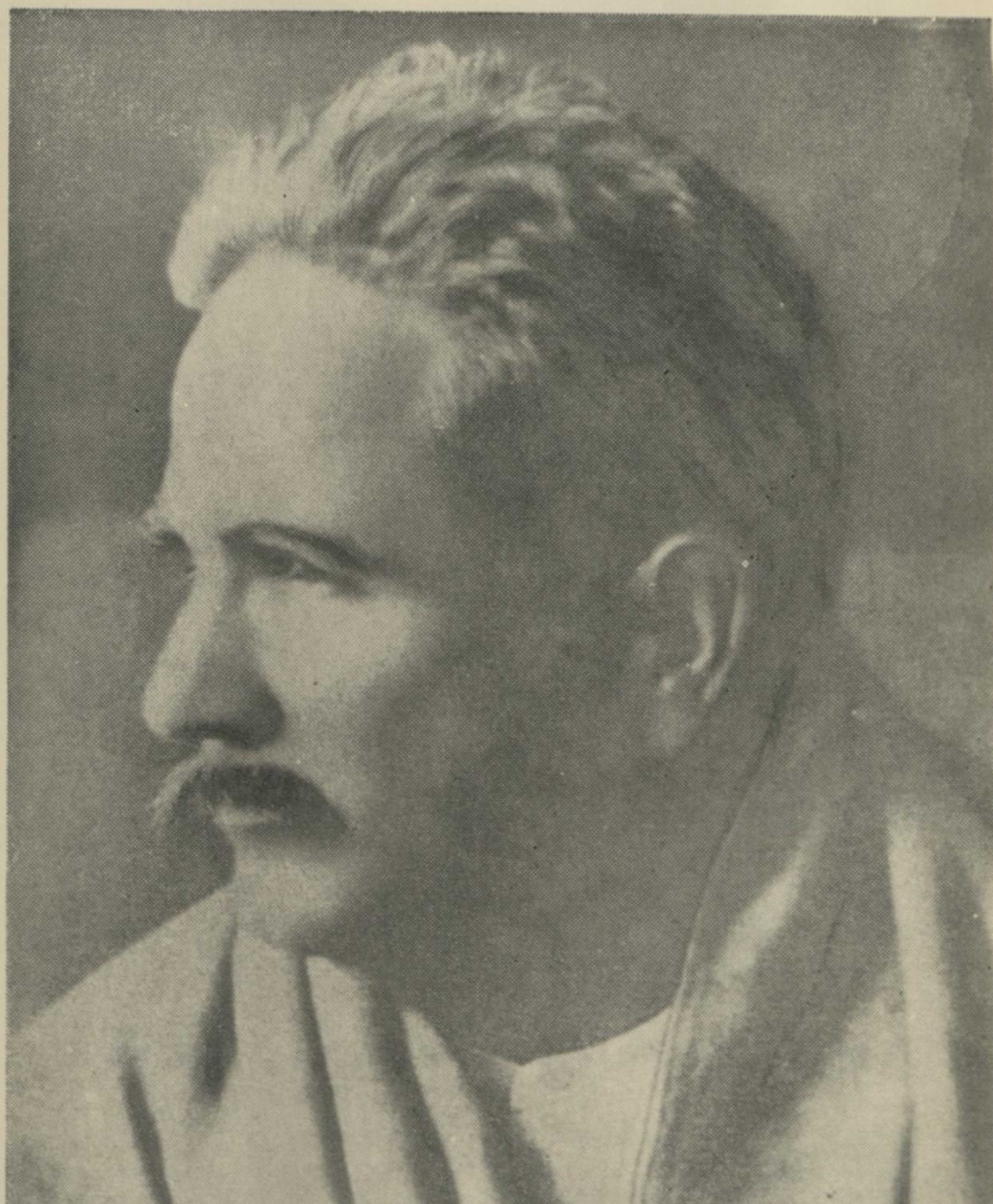
ناشر : محمد اشرف ڈار
معتمد ۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
لاہور

تقسیم کنندگان : اقبال اکادمی پاکستان
۹۰ بی ۔ ۲ گلبرگ نمبر ۳ لاہور

مطبع : رہبر پرنٹنگ پریس لمٹیڈ
باہتمام مرزا محمد صادق
۴ ۔ لیک روڈ لاہور

طبع اول : ۱۹۷۷

تعداد : ۱۱۰۰



علّامہ محمّد اِقبالؒ

(۱۸۷۷—۱۹۳۸)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اطالیہ کے مشہور شاعر "دانتے" (۱۲۶۵ - ۱۳۲۱ء) کی سب سے اہم تصنیف "ڈیوائن کومیڈی" ہے - علاوہ اور کتابوں کے وہ عمر بھر بیشتر اسی ایک تصنیف میں منہمک رہا - انسانی زندگی کی یہ تمثیل اُس کی وفات کے چند ہفتے پہلے مکمل ہوئی اور اِسی سے اُسے شہرتِ دوام نصیب ہوئی - دانتے نے اپنی شاعری سے اطالیہ کے باشندوں کو زندگی کا صحت مندانہ شعور دیا اور اُن میں قومیت کے گہرے احساس کو بیدار کیا -

دانتے کی اس شاہکار تمثیل کا اصلی ماخذ ہسپانوی مصنف، ابن عربی کے افکار اور بالخصوص واقعہ معراج تھا۔ "جاوید نامہ" اسی تمثیل کے جواب میں لکھا گیا۔

اقبال اس سے پہلے "پیام مشرق" جرمنی کے معروف نابغہ، گوئٹے (۱۷۴۹ - ۱۸۳۲ء) کے "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھ چکے تھے۔ اُن کی یہ تصنیف، مغرب کی بے روح مادہ پرست زندگی کے خلاف ایک چیلنج تھی۔ اور اس کا مدعا، اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقائق کو بروئے کار لانا تھا۔

اقبال نے جاوید نامے میں، اسی مُدعا کی تکمیل کی۔ اُنھوں نے دانتے کے برعکس، انسانی زندگی کے تصور کی اساس، خالص بنیادی اسلامی عقائد پر رکھی۔ اور اُسے اپنے فلسفۂ خودی کی مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے پیام مشرق کے

دیباچے میں خود ہی اس نکتے کی نشاندہی اس طرح کی تھی۔

"مشرق، اور بالخصوص اسلامی مشرق، نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ پہلے اُس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون، جس کو قرآن نے ان اللہ لایغیر مابقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور

اجتماعی ، دونوں پہلوؤں پر ، حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔..... اس وقت ، دنیا میں ، اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش ، جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ، اُن میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو ، قابلِ احترام ہے"۔

اقبال نے "جاوید نامہ" میں انسانی زندگی کے بلند اخلاقی اور رُوحانی نشو و ارتقا کو ایک تمثیل کی صورت میں زندہ ، چلتے پھرتے دکھایا ہے ۔ تصورات ، دانش و حکمت پر حاوی ہوں یا تصوف و الٰہیات پر ، جب ایک صحیح ، باوقار اور تنومند فنکار کے ذہن میں ابھرتے ہیں تو وہ انھیں زندۂ جاوید خط و خال عطا کرتا ہے ۔

اقبال نے اپنے افکار عالیہ کو شعری قالب میں سمو کر اُسے ایک جاودانی نقش بنا دیا ۔ ہر چند کہ کتاب کا نام جاوید نامہ ہے اور وہ بظاہر اُن کے فرزندِ ارجمند جاوید اقبال سے ایک طرح منسوب بھی ہے ، جیسا کہ "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے واضح ہے ، لیکن اسی ضمن میں 'سخنے بہ نژادِ نو، کے الفاظ میں اس کے وسیع تر خطاب کا اشارہ موجود ہے ۔ اور میں تو یہ کہوں گا کہ 'جاوید نامہ' فی الحقیقت اقبال کے کلام و پیام کا ایک نقشِ جاودانی ہے ۔ میں ذاتی طور پر اس سے بے حد متاثر ہوا ہوں ۔ اور میری یہ ناچیز ادبی کاوش ، جسے میں نے سرا پردۂ افلاک سے تعبیر کیا ہے ، انھی تاثرات کا نتیجہ ہے ۔

"سرا پردۂ افلاک" مکمل جاوید نامے کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ اُس شاہکار کی ایک مختصر سی متحرک تصویر

ہے جو آزاد اسلوبِ بیان سے خود بخود نمودار ہوئی ہے۔ اس میں مولانائے رُوم فارسی میں گفتگو فرماتے ہیں۔ سوائے چند ایک ناگزیر مرحلوں کے اقبال کے تمام افکار کو اُردو کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ اور انھیں نظم کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اس آزاد ترجمے کے نظمی خط و خال، تمثیلی منظر کے مزاج کے مطابق بدلتے چلے جاتے ہیں اور اصل کتاب کی طرح، نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔

اقبال کی تقریباً ساری غزلیں اُردو میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ البتہ زندہ رود (اقبال) اپنے مرشد روحانی یعنی رومی کے ارشاد کے مطابق کہ

پردۂ تو از نوائے شاعری است
آنچہ گوئی، ماورائے شاعری است

تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

اقبال کی غزل فارسی میں ہے جس کا مطلع ہے :

بانشہٴ درویشی در ساز و دمادم زن
چون پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اور جب "زندہ رود" کا تعارف حوروں سے ہوتا ہے اور وہ اُس سے یہ کہہ کر اُس کے شعر سننے کا تقاضا کرتی ہیں :

شیوہ ھا داری مثال روزگار
یک نوائے خوش دریغ از ما مدار

تو اقبال اپنے روحانی کیف و سرمستی کے عالم میں اپنی قومی زبان ہی میں نغمہ سرا ہوتے ہیں ۔

اگر قارئین کرام میری ان ادنیٰ کاوشوں سے لذت اندوز ہوئے تو میں سمجھوں گا میری یہ مختصر سی محنت کامیاب ہوئی۔

احقر

عوض تبسم

یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء

ملیحہ

زندگی جذبۂ خود نمائی سے سرشار تھی
دفعۃً یہ جہاں
دور و نزدیک کا یہ جہاں
پردۂ غیب سے
عالم رنگ و بُو میں ہویدا ہوا
ماہ و انجم خراماں ہوئے
ان اندھیری فضاؤں میں دیپک جلے
نیلگوں چرخ پر
آفتاب اپنی سیمیں طنابوں کا زر بفت خیمہ
سجاتا ہوا آ گیا
دُور اُفق پر اجالا ہُوا
صبح اول کی پر نور کرنوں نے اس عالم نو
کو آغوش میں لے لیا
لیکن اس وقت
یہ جہاں کیا تھا

اک خاکداں تھا
اک بیابان بے کارواں تھا
اس کے کہسار میں
آبشاروں کے چشمے ابلتے نہ تھے
شاخساروں پہ نغمے مچلتے نہ تھے
مرغزاروں میں آہو کی نازک خرامی نہ تھی
بحر و بَر ، چند بے جان سایوں کی مانند
پھیلے ہوئے ہر طرف ،
سبزہ ، باد بہاراں سے نا آشنا
ظلمت خاک کی سخت گھمبیر گہرائیوں میں ابھی
سو رہا تھا کہیں
سر چھپائے ہوئے
آسماں نے کہا
اے زمیں !
میری پہنائیوں میں کوئی چیز تجھ سی
سبک، بے حقیقت، نہیں
میری قندیل کی روشنی کے سوا
تیری آنکھوں میں کوئی بصارت نہیں
تو فقط خاک ہے

خاک اگر کوہ الوند بن جائے
پھر بھی وہی خاک ہے
یا اُٹھو
زندگی میں کوئی آن پیدا کرو
دلبری شان پیدا کرو
یا پھر اپنی حقیقت کی بے مایگی
پردۂ مرگ میں ڈھانپ لو، سو رہو

سن کے طعنے فلک کے، زمین کا ندامت سے سر جھک گیا
بارگاہ خداوند ارض و سماوات میں
اپنے مجبور احساس کی درد مندی کا دکھڑا سنانے لگی
رو پڑی، گڑگڑانے لگی
اُس کی اس حالت زار کو دیکھ کر
آسمان کے دریچے کھلے
اور عرش برین کے پرے سے یہ آواز آنے لگی

"تو امین ہے مگر بے یقین ہے
تجھ کو اپنی خبر بھی نہیں ہے
یہ مہ و مہر کی روشنی

اسکی کچھ بھی حقیقت نہیں
نور اصلی ہے ہنگامۂ زندگی
نور اصلی کہ ہے نور جاں
سِرِّ عالم ہے وہ
روح آدم ہے وہ
چشم آدم کی بینائیاں
تیز ہیں، راہ داں
جبرئیل امین سے بھی بیدار تر
عقل انساں کا سحر و فسوں
اس کا عشق و جنوں
آسماں کا بھی دل چیر دے گا
وہ فلک کے ستارے چنے گا
وہ ملائک سے باتیں کرے گا"

(پس منظر میں)
چشم او روشن شود از کائنات
تابہ بیند ذات را اندر صفات

غزل

بکشاے لب کہ قند فراوانم آرزوست
بنماے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
یک دست جامِ بادہ و یک دست زلف یار
رقص چنین میانۂ میدانم آرزوست
دی شیخ با چراغ همی گشت گردِ شهر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین همرهانِ سُست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود، جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می‌نشود آنم آرزوست

دیکھتے دیکھتے چھپ گیا آفتاب
موج بے تاب پانی کی ابریشمی سطح پر سو گئی
شام نے ڈوبتی روشنی کے چمن زار سے
جگمگاتی ہوئی اک کرن توڑ لی
وہ کرن تھی
کہ جیسے لب بام ہو

اک در خشندہ جلوہ کسی ور کا
ایک پیکر تھا وہ سرمدی نور کا

اقبال : زندگی کیا ہے ؟ کیا ہے راز وجود
کون موجود کون ہے محمود

رومی : هست موجود آنکه می خواهد نمود
آشکارائی تقاضاے وجود

زندگی خود را بخویش آراستن
بر وجودِ خود شهادت خواستن
زنده ای یا مرده ای یا جان بلب
از سه شاهد کن شهادت را طلب
شاهد اول شعور خویشتن
خویش را دیدن بنور خویشتن
شاهدِ ثانی شعورِ دیگرے
خویش را دیدن بنور دیگرے
شاهد ثالث شعور ذات حق
خویش را دیدن بنور ذات حق
پیش این نور ار بمانی استوار
حی و قائم چون خدا خود را شمار

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

اقبال : کس طرح سے دور ہوتا ہے حجاب
ٹوٹتا ہے کوہسارِ خاک و آب

رومی : ہاں اگر سلطان ترا آید بدست
می تو ان افلاک را از ہم شکست

از طریقِ زادن اے مرد نکو
آمدی اندر جہان چار سو

ہم برون جستن بزادن می‌توان
بند ہا از خود کشادن می توان

لیکن این زادن نہ از آب و گل است
داند آن مردی کہ او صاحب دل است

آن ز مجبوری است ، این از اختیار
آن نہان در پردہ ہا ، این آشکار

آن یکے با گریہ این باخندہ ایست
یعنی آن جوئندہ این یا بندہ ایست

اقبال : یہ طریق زادن و مردن ہے کیا
راز کیا ہے اس حضور و غیب کا

رومی : شیوه ہاے زندگی غیب و حضور
آں یکی اندر ، ثبات این در مرور
گہ بجلوت می گدازد خویش را
گہ بخلوت جمع سازد خویش را
جلوت او روشن از نورِ صفات
خلوت او مستنیر از نورِ ذات
عقل او را سوے جلوت می کشد
عشق او را سوے خلوت می کشد
عقل در کوہے شگافے می کند
یا بگردِ او طوافے می کند
عشق ، شبخونے زند بر لا مکان
گور را نادیدہ رفتن از جہان
عاشقی ، از سو بہ بے سوئی خرام
مرگ را بر خویشتن گردان حرام

اقبال : کس طرح سے عطا ہو بشر کو نظر
جو گزر جائے افلاک کو چیر کر

رومی : تو ازین نہ آسمان ترسی ، مترس
از فراخاے جہان ترسی ، مترس

چشم بکشا بر زمان و بر مکان
این دو یک حال است از احوالِ جان
تا نگہ از جلوه پیش افتاده است
اختلاف دوش و فردا زاده است
دانہ اندرِ گل بہ ظلمت خانہٴ
از فضاے آسمان بیگانہٴ
هیچ می داند کہ در جای فراخ
می توان خود را نمودن شاخ شاخ
اے کہ گوئی محمل جان است تن
سرِّ جان را در نگر، بر تن متن
چیست جان؟ جذب وسرور وسوز ودرد
ذوق تسخیر سپہر گرد گرد
چیست تن؟ با رنگ وبو خو کردن است
با مقامِ چار سو خو کردن است
این بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

اقبال: ناگہاں، آسماں
اک سحابِ نور میں غلطاں ہوا

اِس سحاب نور سے
اک فرشتہ سوے عالم تھا روان
چہرۂ دو رخ لیے
ایک یکسر شعلہ تھا ، ایک تھا یکسر دھواں
اک شبِ تاریک تھا
اک شہابِ ضو فشاں
اور اس کے بال و پر تھے سرخ و زرد
سبز و سیمین و کبود و لاجورد
تیز رو مثلِ خیال
اور زمین سے آسمان تک اسکا رم
ایک لمحہ ، ایک دم
ہر زمان ، اک نئی جانب روان
ہر گھڑی.........
اک نیا اس کا جہان
کون ہے یہ ، کون ہے یہ ، کون ہے ؟

رزوان : گفت زروانم ، جہان را قاهرم
هم نہانم از نگہ ، هم ظاهرم
بستہ هر تدبیر با تقدیر من

ناطق و صامت همه نخچیر من
غنچه اندر شاخ می بالد زمن
مرغک اندر آشیان نالد زمن
دانه از پروازِ من گردد نهال
هر فراق از فیضِ من گردد وصال
من حیاتم ، من مماتم ، من نشور
من حساب و دوزخ و فردوس و حُور
آدم و افرشته در بندِ من است
عالم شش روزه فرزندِ من است
لی مع الله هر کرا در دل نشست
آن جوان مردے طلسمِ من شکست

(۲)

اقبال : جانے اس کی نگاہوں میں کیا چیز تھی
جس نے دنیاے کون و مکان چھین لی
ایک دنیاے نوزادہ تھی سامنے
یا وہی شے تھی بدلی ہوئی سامنے
ایک جان چھن گئی ، ایک جان مل گئی
اک نئی دل کو تاب و توان مل گئی
پردگی ہا بے حجاب آمد پدید
نغمۂ انجم بگوشِ من رسید

زمزمۂ انجم

(۱)

عقل ہے حاصلِ حیات ، عشق ہے سرِ کائنات
پیکرِ خاک کر خرام این سوے عالم جہات
زہرہ و ماہ و مشتری ، تیرے رقیب ہی سہی
ہدیہ تری نگاہ کا ، کشمکشِ تجلیات
صدق و صفا ہے زندگی ، نشو و نما ہے زندگی
روزِ ازل سے تا ابد ملکِ خدا ہے زندگی

---

(۲)

دبدبۂ قلندری ، طنطنۂ سکندری
وہ ہمہ جذبۂ کلیم، یہ ہمہ سحرِ سامری
ایک نگہ سے مار دے ، ایک سپہ سے مار دے
ایک ہے صلح و آشتی، ایک ہے جنگ و داوری
ضرب قلندری دکھا ، سدِ سکندری کو توڑ
رسم کلیم تازہ کر ، رونق سامری کو توڑ

فلکِ قمر

یہ فلک ، یہ زمیں
ماہ و پروین کی یہ بزم گہِ حسیں
تیری میراث ہے

ان نئی رہگزاروں ، نئی شاہراہوں میں
تو اجنبی تو نہیں

پھر یہ نا محرمانہ نظر کس لیے
یاں تو ہر شے ہر اک چیز ہے
تیرے زیر نگیں

اور یہ دنیا ہے کیا ؟
تیرے گوش و نظر کے تراشے ہوئے
چند اصنام ہیں

دی و فردا ہے کیا
تیرے ہوش و خرد کے بنائے ہوئے
عارضی نام ہیں

آ - آ -

اپنی اس جستجو و طلب کے بیابان میں
مثل دیوانہ آ

اور اپنے سجائے ہوئے بتکدے توڑ دے
اور پھر جب زمیں آسماں سے گزر جائے تو
اس جہاں ، اُس جہاں سے گزر جائے تو
اپنے اللہ سے
اور تازہ نئے آسماں مانگ لے
اور بہتر زمان و مکاں مانگ لے
جستجوؤں کی غایت تری ہے یہی
اے مسافر تری زندگی ہے یہی

اقبال : میں یونہی ان فضاؤں میں چلتا گیا
وہ سماں تھا عجب
میں بلندی پہ تھا
اور مرے جسمِ خاکی کے نیچے تھی قندیلِ شب
میرا سایہ مرے سر کے اوپر رواں
تھے قمر کے کہستاں مرے سامنے
خافطین ، یلدرم کے جبل

دودھا بردھاں ۔ شعلہ ھا درشکم
اور وہ پر ھول خاموشیاں
ایک دنیاے فرسودہ افسردہ
بے رنگ و صوت
نہ وھاں زندگی ، نہ وھاں کوئی موت
نہ کوئی ولولہ ، نہ کوئی اضطراب
نہ کوئی حادثہ نہ کوئی انقلاب

پیر رومی نے کہا ،

رومی : زودتر بر خیز و گامے پیش نہ
دولتِ بیدار را از کف مدہ
ھر چہ پیش آید ترا اے مردِ ھوش
گیر اندر حلقہ‌ھاے چشم و گوش
چشم اگر بیناست ھر شے دیدنی است
در ترازوے نگہ سنجیدنی است
ھر کجا رومی برد آنجا برو
یک دو دم از غیر او بیگانہ شو

اقبال : میں چلتا گیا
پیر رومی کے ہمراہ چلتا گیا
جس طرح کوئی نابینا اپنے کسی رهنما
کے سہارے چلا جا رہا ہوں کہیں
اس جہانِ قمر کے اندھیروں
کی پر پیچ راھوں میں اپنے قدم
اک سراپاے ظلمت
سیہ غار میں جا پڑے
وہ تاریکیاں
ماہِ تاباں جہاں لڑکھڑا کر چلے
نورِ خورشید مشعل اٹھا کر چلے
دفعتہً ظلمتیں چھٹ گئیں
اک اجالا ہوا
شب کی تاریکیوں میں سویرا ہوا
ایک وادی ، بے کراں
اک زمیں ، بے آسماں
اک فضا ، یکسر سرورِ
سایہ بھی تصویر نور
ہر طرف سنگ گراں زنارِ بند

دیو کی مانند
سر کشیدہ نخل ہائے سر بلند
اک جگہ ، اک پیڑ کے سائے تلے
عارف ہندی نژاد
موے سر باندھے ہوئے
عریاں بدن
اور اس کے پیکرِ عریاں کے گرد
اک حسیں مارِ سفید
حلقہ افگن ، حلقہ زن
ایک انساں ، آب گل کی سر زمین سے دور تر
یہ جہاں اس کے تخیل کے
صنم آباد ہیں
ایک پیکر ، ایک بت
اور اس کا وقت ، اس کی زندگی
بے تعلق بے نیاز
گردشِ ایام سے
چرخِ نیلی نام سے

عارف ہندی : اے جہانِ شرق کے رہبر بتا

آپ کے ہمراہ یہ جو آپ کا
ہم قدم ہے؟ ہم سفر ہے، کون ہے؟
اس کی آنکھوں میں نظر آتی ہے مجھ کو زندگی
آرزوے زندگی
جستجوے زندگی

رومی: مردے اندر جستجو آوارۂ
ثابتے بافطرتِ سیارۂ
پختہ تر کارش ز خامی ہاے او
من شہیدِ نا تمامی ہاے او
چون عقابِ اُفتد بصیدِ ماہ و مہر
گرم رو اندر طوافِ نُہ سپہر
حرف با اہلِ زمین رندانہ گفت
حور و جنت را بت و بتخانہ گفت
شعلہ ہا در موجِ دودش دیدہ ام
کبریا اندر سجودش دیدہ ام

عارف ہندی: بے رنگی حق نام ہے عالم سارا رنگ
کیا شے ہے یہ آدمی کیا عالم کا رنگ

رومی : آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم این شمشیر را سنگِ فسن
چشم بر حق باز کردن بندگی است
خویش را بے‌پردہ دیدن زندگی است
بندہ چون از زندگی گیرد برات
ہم خدا آن بندہ را گوید صلات
ہر کہ از تقدیر خویش آگاہ نیست
خاکِ او با سوزِ جان ہمراہ نیست

عارفِ ہندی: اہل مشرق کو خبر اس کی نہیں
اس حقیقت پر نظر اس کی نہیں
ہم فلک کے ہیں مکین
کام ہے اپنا یہی
دیکھنا ، پھر دیکھنا ، پھر دیکھنا
کل نظر میری اٹھی
سامنے تھا کوہسار قشمرود
دیکھتا کیا ہوں فرازِ کوہ سے
اک فرشتہ جانبِ دنیا چلا
میں نے پوچھا کیا ہوا

آسماں کو چھوڑ کر کیوں آ گیا
اس جہاں میں کیا نظر آیا تجھے
خاکداں میں کیا نظر آیا تجھے
یہ جہاں ، یہ خاک داں کچھ بھی نہیں
خاکِ مردہ میں نہاں کچھ بھی نہیں

اقبال : پیرِ ہندی کہہ کے یہ چپ ہو گیا
پھر مری جانب نظر کی اور کہا

عارف ہندی : بول مرگِ عقل کیا ہے ؟
اقبال : ترکِ فکر
عارف ہندی : اور دل کی موت کیا ہے ؟
اقبال : ترکِ ذکر
عارف : یہ ہمارا جسم کیا ہے
اقبال : گردِ راہ
عارف : اور کیا ہے روح
اقبال : رمز لاالہ'
عارف : کیا ہے آدم کی حقیقت
اقبال : سرہ
عارف : اور یہ دنیا ؟

اقبال : وہ خود ہے روبرو

عارف : غایتِ علم و ہنر

اقبال : جیسے ہو پوست

عارف : کیا ثبوت اس کا ؟

اقبال : جمالِ روے دوست

عارف : عامیوں کا دین کیا شے ہے ؟

اقبال : شنید

عارف : اور عارف کا یقیں

اقبال : عینِ دید

اقبال : عارف ہندی نے جس دم
یہ مری باتیں سنیں
دفعتہً اس کے لبوں پر آ گئے
حرف ھاے دلنواز و نکتہ ھاے دل نشیں

نغمۂ نا سخن از عارف ہندی

(۱)

کیسے حق کی ذات کو یہ سنسار چھپائے
پانی کے اِک نقش سے غوطہ رُک نہ جائے

(۲)

وہ وہ نئے سنسار میں نئے جنم کی شان
نئی نویلی چھلبلیں ، نئے روپ کا مان

(۳)

حق کی ذات امر ہے نرمل جیون جان
اس فانی انسان کو حق کی کیا پہچان

(۴)

وقت؟ یہ سمجھو جس طرح شیرینی میں زہر
اس کی رحمتِ عام میں شامل اُس کا قہر

(۵)

کافر پُتلا موت کا ، غازی شیر پلنگ
غازی سے کس طرح ہوا اک مُردے کی جنگ

(۶)

وہ کافر جو بتوں سے من کی جوت جگائے
بہتر اس دیندار سے جو کعبے میں سو جائے

(۷)

اندھے کا کیا دیکھنا ہر دم دھوکا کھائے
دیکھ سورج کے نبھ میں رین کبھو نہ آئے

(۸)

دانہ مل کر خاک سے بوٹے پھول اگائے
آدم مل کے خاک سے اپنا روپ گنوائے

(۹)

میں نے پوچھا پھول سے ، اس مٹی کے سنگ
رہ کر کیسے پائے تو یہ خوشبو یہ رنگ
بولا سن اے باورے وہی ہے اسکا راز
جوں بجلی کے تار پہ تو سن لے آواز

راوی : مرد عارف کہہ کے یہ چپ ہو گیا
اپنی ہی سر مستیوں میں کھو گیا
تھے اسی کے ساتھ ذرے رشکِ طور
وہ گیا تو گم ہوئے نور و ظہور

اقبال : دیکھتا ہوں میں فرازِ کوہ پر
ہو رہی ہے جلوہ گر
اک حسیں ناز آفریں
خاتمِ تاریکیِ شب کی نگیں
جگمگا اٹھے ہیں پھر کوہ و کمر کے بام و در
سوچتا تھا میں یہ کیا ہے ماجرا
پیر رومی نے کہا

رومی : دیدی این پیکر ؟ چو سیم تابناک
زاد در اندیشۂ یزدانِ پاک
باز بے تابانہ از ذوقِ نمود
در شبستانِ وجود آمد فرود
همچو ما آوارہ و غربت نصیب
تو غریبی ، من غریبم ، او غریب

شان او جبریلی و ناموش سروش
می برد از هوش و می آرد بہوش
زخمۂ شاعر بسازِ دل ازوست
چاکہا در پردۂ محمل ازوست
دیدہ ام در نغمۂ او عالمے
آتشے گیر از نوائے او دمے

نوائے سروش

ترسم کہ تو می رانی زورق بسرب اندر
زادی بہ حجاب اندر ، میری بحجاب اندر
برکشت و خیابان پیچ ، بر کوہ و بیابان پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر
این صوتِ دل آویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جنان حورے ، نالہ بہ رباب اندر

اقبال: شوق ہے خود اپنی منزل کی دلیل
شوق ہے پروازِ بالِ جبرئیل

اک قدم اس کا رہِ دور و دراز
اک سفر اس کا جہانِ ترکتاز
لے اڑی مجھ کو مری پروازِ دید
سامنے میرے تھی مرزِ یرغمید
اللہ اللہ وہ مقامِ سر گران
سر جھکاتے ہیں جہاں ہفت آسماں

حق نے مجھ کو فطرتِ بیدار دی
قوتِ دل ، طاقتِ گفتار دی
ہو گئے مجھ پر عیاں اسرارِ کل
کھل گئے مجھ پر طواسینِ رُسل
یوں ہوئے میری نظر میں آشکار
گوتم و رقاصہٴ توبہ گزار

گوتم : یہ مئے کہنہ ، یہ معشوق جواں کچھ بھی نہیں
چشم بینا ہو تو یہ حورِ جناں کچھ بھی نہیں
اپنے من میں ڈوب جا ، کس بات سے ڈرتا ہے تو
تو ہی تو ہے یہ وجودِ دو جہاں کچھ بھی نہیں
میں نے جس رہ کو کیا طے پائے مژگاں سے ، وہاں

کاروان و منزل و ریگِ رواں ، کچھ بھی نہیں
جو تجھے اپنے عمل سے مل گئی ، جنت وہی
ورنہ فردوس بہار جاوداں کچھ بھی نہیں
اس جہاں میں رہ کے ہو جا اس جہاں سے بے نیاز
چھوڑ دے یہ غیب، یہ وہم و گماں، کچھ بھی نہیں

رقاصہ: فرصتِ کشمکش نہ دے اس دلِ بیقرار کو
اور بھی تابدار کر گیسوئے تابدار کو
ذوقِ حضور سے یہاں رسم صنم گری پڑی
عشق فریب دے گیا جانِ امیدوار کو
تجھ سے مرے جگرمیں ہے برقِ تپاں کی بے کلی
مہر و قمر ترس گئے تلخیِ انتظار کو
تیشے سے پارہ پارہ ہے سنگِ گراں تو کیا ہوا
سر پہ اٹھا لیا یہاں عشق نے کوہسار کو

دیکھ یہ زرتشت ہے یہ اہرمن
کس طرح باہم ہیں مصروفِ سخن

اہرمن: از تو مخلوقاتِ من نالاں چو نے
از تو ما را فرودین مانند دے
در جہان خوار و زبونم کردۂ
نقشِ خود رنگین ز خونم کردۂ
زندہ حق از جلوۂ سینائے تو
مرگِ من اندر یدِ بیضائے تو
تکیہ بر میثاق یزدان ابلہی است
بر مرادش راہ رفتن گمرھی است
زہرہا در بادۂ گلفامِ اوست
ارہ و کرم و صلیب انعامِ اوست
از چنیں پیغمبری باید گذشت
از چنیں ملا گری باید گذشت

خیز و در کاشانۂ وحدت نشیں
ترکِ جلوت گو و در خلوت نشین

زر تشت : ُنور دریاے است ، ظلمت ساحلش
هم چو من سیلے نہ زاد اندر دلش
اندر و نم موجہاے بیقرار
سیل را جز غارتِ ساحل ، چہ کار
خویشتن را وا نمودن زندگی است
ضربِ خود را آزمودن زندگی است
از بلاها پختہ‌تر گردد خودی
تا خدا را پردہ‌در گردد خودی
مردِ حق بین جز بحق، خود را ندید
لااللہ می گفت و در خون می تپید
عشق را در خون تپیدن آبروست
اره و چوب و رسن عیدینِ اوست
در رہِ حق هرچہ پیش آید نکوست
مرحبا نامہربانی هاے دوست
جلوهٔ حق چشمِ من تنہا نخواست
حسن را بے انجمن دیدن خطاست
راہِ حق با کاروان رفتن خوش است
همچوجان اندر جہان رفتن، خوش است

اقبال : تھا نظر کے سامنے اب کوهسارِ هفت مرگ
وادیِ بے طائر و بے شاخ و برگ
ماهتاب اس کے غبار و گرد کی تاریکیوں سے داغدار
آفتاب اس کی فضا میں تشنگی سے دلفگار
ایک دریائے روان سیماب کا
هر طرف بہتا هوا
تند سیر و موج موج وپیچ پیچ
اور اس سیماب کے طوفان میں
اک جوان تھا تا کمر ڈوبا ہوا
اور اس سیلاب میں
بوند بھر پانی کو بھی ترسا هوا
اور اُدھر
اک کنارے پر کھڑی ، جلوہ فگن
اک زنِ نازک بدن
نازنین ، ناز آفرین
کافری آموزِ پیرانِ کہن
میں نے پوچھا کون ہے کیا نام ہے ؟
بولی افرنگیں هوں میں
کام ہے میرا فسونِ سامری

چشم و گوش و ہوش کی غارت گری
ناگہاں وہ جوئے سیمیں تھم گئی
تھی ابھی وہ مضطرب
اور ابھی یخ بست تھی
اور اس مردِ جواں کے جسم میں
ہڈیوں کو پارہ پارہ کر گئی
چیخ اٹھا ، ہائے مری تقدیر ، ہائے
ہائے یہ فریادِ بے تاثیر، ہائے
بولی افرنگیں تو اب روتا ہے کیا
اس ترے رونے سے اب ہوتا ہے کیا
ابنِ مریم ، وہ چراغِ کائنات
نور سے جس کے منور شش جہات
وہ فلاطوس اور وہ کارِ صلیب
یاد ہے تجھ کو وہ سارا ماجرا
کیا کیا تھا اس نے، تو نے کیا کیا
پوجتا ہے تو بتانِ سیم خام
تجھ پہ ہے ایمان کی دولت حرام
تو نے اپنی لذتِ تن کے لیے

روح کی پروا نہ کی
بیکراں دولت تھی، تو نے ہار دی،

اقبال: میں نے دیکھا کہ بوجہل ہے
سخت افسردہ پژمردہ حسرت زدہ
اپنے لات و منات و ہبل کی تباہی پہ نوحہ سرا
اپنی بے چارگی، بے بسی، خستہ حالی
کا دکھڑا سناتا ہوا
چیختا، بلبلاتا ہوا

ابو جہل: سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
دل بغائب بست و از حاضر گسست
نقشِ حاضر را فسونِ اُو شکست
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاهِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بریک خوان نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش درساختہ
احمران با اسودان آمیختند
آبروے دودمانے ریختند
اے هبل ، اے بندہ را پوزش پذیر
خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

او جمول [illegible] از [illegible] داغ داغ

از در او کعبه را گل کند چراغ

دل بصاحب بست و از حاضر گسست

نقش حاضر را نسوزد او شکست

مذهب او قلندر مملکت و نسب

از قریش و منکر از فضل عرب

فلکِ عطارد

اقبال : اللہ اللہ یہ عالم کفِ خاک کے
شوق پرواز کا
میں ابھرتا ، گزرتا گیا
آسمانوں کی پہنائیوں سے گزرتا گیا
جانے میں ہی فلک میں تھا کھویا ہوا
یا فلک میرے دل میں سمویا ہوا
ہر گھڑی ، ہر زمان
اک نیا آسماں تھا مرے سامنے
اور ہی اک جہاں تھا مرے سامنے
دیکھتا کیا ہوں
پھر اک نرالا جہاں
کوہ و میدان کا، بحرو بر کا جہاں،
اپنے اس عالمِ خاک کا سا جہاں
آ گیا سامنے
دستِ انساں کی صنعتگری سے تہی
خردہ گیری کی واں کوئی صورت نہ تھی

میں نے کی عرض
اے پیر رومی بتا
کون سی جا ہے یہ
کیسی دنیا ہے یہ
کس جہاں میں ہیں ہم ؟
اس جگہ زندگی کا نہیں کچھ نشاں
پھر یہ کس سمت سے، آ رہی ہے، اذان ؟

رومی : تو ندانی این مقامِ اولیا است
آشنا این خاکدان با خاکِ ماست
بوالبشر چوں رخت از فردوس بست
یک دو روزے اندرین عالم نشست
ایں فضاھا سوزآھش دیده است
ناله ھاے صبحگاھش دیده است
زاھدانِ این مقام ارجمند
پاک مردان، از مقاماتِ بلند
پاک مردان چوں فضیل و بوسعید
عارفان مثلِ جنید و بایزید
خیز تا مارا نماز آید بدست
یک دو دم سوز و گداز آید بدست

اقبال : دو قدم آگے بڑھا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک گوشے میں ہیں
دو بزرگ
اس طرح محوِ نماز
کھنچ گئی ہو جیسے تصویر نیاز
سجدہ ریزی سربسر آن کا قیام
مقتدی تھا تُرک ، افغانی امام
اُس طرف
پیرِ رومی
سربسر غرقِ حضور
سربسر ذوق و سرور
دل عجب حیرت میں تھا
پیرِ رومی نے کہا
رومی : ارضِ مشرق زین دو کس بہتر نہ زاد
ناخنِ شان عقدہ ہاے ما کشاد
سید السادات مولانا جمال
زندہ از گفتارِ او سنگ و سفال
تُرک سالار ، آن حلیمِ دردمند
فکرِ او مثلِ مقامِ او بلند

باچنین مردان دو رکعت طاعت است
ورنہ آن کارے کہ مزدش جنت است

اقبال : آہ وہ قرأت ، وہ مردِ سخت کوش
سورۂ والنجم ، وہ دشتِ خموش
سن کے جس کو جھوم اٹھے قلبِ خلیل
وجد میں آ جائے روحِ جبرئیل
آہ ابھرے سینۂ افلاک سے
شور الا اللہ اٹھے خاک سے
شعلہ بخشے حو زبانِ دود کو
مست کردے نغمۂ داؤد کو
ہر نفس اس کا حدیثِ بے حجاب
ترجمانِ سورۂ ام الکتاب
ہم اٹھے بعدِ نماز
اور میں نے از رہِ عجز و نیاز
اٹھ کے، اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا
پیرِ رومی نے مری جانب نظر کی
اور کہا

روسی : بنگرید این ذرۂ گردون نورد
در دلِ او یک جہانِ سوز و درد
چشم جز برخویشتن نکشادۂ
دل بکس نادادۂ ، آزادۂ
تند سیر اندر فراخاے وجود
من ز شوخی گویم او را زنده رود

اقبال : سن کے یہ الفاظ پیرِ رومی کے
سید السادات مولانا جمال الدین افغانی نژاد
میری جانب دیکھ کر گویا ہوئے

افغانی : زند رود! از خاکدانِ ما بگو
از زمین و آسمانِ ما بگو
خاکی و چون قدسیان روشن بصر
از مسلمانان بده مارا خبر

اقبال : کس طرح حالِ مسلماں ہو بیان
کہہ نہیں سکتی زباں
تھی یہی ملت کبھی گیتی شکن
آج اس کے درمیاں۔

آ گئی آویزشِ دین و وطن
روح و تن مردہ ہوئے
ناامیدی، خستگی ، ضعفِ یقین
چھن گئی ہے قوتِ دینِ مبین
تُرک و ایران و عرب ، مستِ فرنگ
ان کی گردن پر ہے اب دستِ فرنگ
غارتِ سلطانیِ مغرب کو دیکھ
دیکھ زورِ اشتراک
ملتِ بیضا کی سلطانی گئی
دینِ ملت کی وہ تابانی گئی

افغانی : لُردِ مغرب ، آن سراپا مکر و فن
اهلِ دین را دادہ تعلیم وطن

او بفکر مرکز و تو در نفاق
بگزر از شام و فلسطین و عراق

تو اگر داری تمیز خوب و زشت
دل نہ بندی با کلوخ وسنگ و خشت

چیست دین برخاستن از روے خاک
تا ز خود آگہ گردد جانِ پاک

می نگنجد آنکه گفت الله هو
درِ حدودِ این نظامِ چار سُو

پرِ که از خاک و برخیزد ز خاک
حیف اگر در خاک میرد جانِ پاک

گرچه آدم بردمید از آب و گل
رنگ و نم چون گُل کشید از آب و گل

حیف اگر در آب و گل غلطد مدام
حیف اگر بر تر نپرد زین مقام

گفت تن ، در شو بخاکِ راهگذر!
گفت جان ، پهنائے عالم را نِگر!

جان نگنجد در جهات اے هوشمند
مردِ حر بیگانه از هر قید و بند

حر ز خاکِ تیره آید در خروش
زانکه از بازان نیاید کارِ مُوش

آن کفِ خاکے که نامیدی وطن
این که گوئی مصر و ایران و یمن

با وطن اہلِ وطن را نسبتے است
زانکه از خاکش طلوعِ ملتے است

اندرین نسبت اگر داری نظر
نکتهٔ بینی ز مو باریک تر

گرچہ از مشرق برآید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب

در تب و تاب است از سوزِ درون
تا ز قید شرق و غرب آید برون

بردمد از مشرقِ خود جلوه مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روے نسبت خاوری است

اقبال : میں نے پوچھا
سیدِ عالی نسب
آپ کی ذاتِ گرامی
اس جہانِ شرق کی ہے رہنما
ہم ہیں خاکی، خاکیوں کا یہ جہاں
خاکیوں کی زندگی
ہے فقط اک کشتیٔ بے ناخدا
عالمِ قرآں ہے کیا

افغانی: عالمے در سینۂ ما گم ہنوز
عالمے در انتظارِ قم ہنوز
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ
شامِ اُو روشن‌تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید
چون دلِ مومن کرانش ناپدید
لایزال و وارداتش نو بنو
برگ و بارِ محکماتش نو بنو
باطنِ او، از تغیّر بے غمے
ظاہرِ او، انقلابِ ہر دمے
اندرونِ تست آن عالم نگر
تا دہد از محکماتِ خود خبر

اقبال: اتنا سنتے ہی، میری نظر جھک گئی
جانے کیا ہو گیا
میں کہاں کھو گیا
ایسا محسوس ہونے لگا
میرے دل کی فضا گنگنانے لگی
میرے کانوں میں آواز آنے لگی

خلافتِ آدم: دو عالم میں پیدا ہیں آثارِ عشق
یہ آدم ہے منجملہ اسرارِ عشق
نہ یہ راز دنیائے اجسام کا
نہ یہ کارنامہ ہے ارحام کا
نہ یہ سام سے ہے نہ یہ حام سے
نہ نسبت اسے روم سے شام سے
نہ اس کے لیے ہے طلوع و غروب
نہ اس کا شمال اور نہ اس کا جنوب
امام و صلواۃ و حرم ہے یہی
مداد و کتاب و قلم ہے یہی
ہر اک غیب اس کے لیے ہے حضور
نہ اس کے حدود اور نہ اس کے ثغور
سمائے جو آدم میں، عالم ہے وہ
سمائے نہ عالم میں آدم ہے وہ
فلک سے فراتر ہے اس کا مقام
ہے تہذیب، انسان کا احترام

حکومتِ الٰہی

بندۂ حق بے نیاز ہر مقام
یہ غلام اس کا نہ وہ خود ہے غلام
بندۂ حق سر بسر آزاد ہے
اس کا دل ، اس کی نظر ، آزاد ہے
دین و آئیں اس کا سب اللہ کا
تلخ و نوشیں اس کا سب اللہ کا
عقل اپنی ذات سے غافل نہیں
غیر کے بہبود کی قائل نہیں
اس زمیں کی آمری ہے قاہری
جز خدا ہر قاہری ہے کافری

وہ آمر کہ ہے قاہرِ پختہ کار
قوانین کا ایک سنگیں حصار
وہ شاہیں کا اک پنجۂ سخت گیر
بناتا ہے چڑیوں کو اپنا مشیر
چھلاوہ ہے وہ شرع و دستور کا
وہ بے نور ہے سرمہ بے نور کا

یہ ہے تاجداروں کی شرعِ شریف
کہ آقا ہو فربہ، مزارع نحیف
عجب رنگِ دستورِ افرنگ ہے
کہ جمہور کی زندگی تنگ ہے
یہ شاطر وہ شطرنج کے گل کھلائے
کہ قوموں کو مہرے بنا کر نچائے
سیاست نہیں ہے یہ ہے شاطری
یہ سوداگروں کی ہے سوداگری

ارض ملک خدا است

یہ جہانِ رنگ و بو
یہ کاخ و کو
تیری دولت ہے تری میراث ہے
دانہ دانہ چن لے اس کی خاک سے
توڑ لے تاروں کو تو پیشانیِ افلاک سے
چاک کر دے سینۂ کہسار کو
نور سے اپنے بجھا دے نار کو
ترک کر دے راہ و رسمِ آزری

اک نیا عالم بسا
ایک دنیائے نوی
یہ جہانِ رنگ و بو، یہ کاخ و کو
ان کو اپنے قلب میں آنے نہ دے
دل حریم اس کا ہے، اس کو سونپ دے
جس نے حرفِ لاالٰہ ازبر کیا
اپنے قلب و روح میں
اک جہانِ تازہ پیدا کر لیا
فقر جوع و رقص و عریانی نہیں
فقر سلطانی ہے، رہبانی نہیں

حکمتِ خیر کثیر

دولتِ حکمت ہے کیسی بے نظیر
حق نے حکمت کو کہا خیرِ کثیر
علم حرف و صوت کی پرواز ہے
علم سوز و ساز کی آواز ہے
اس کی ہر تفسیر ہے تفسیرِ کل
اس کی ہر تدبیر ہے تقدیرِ کل

وہ کہے تو دشت سے ابھریں حباب
وہ کہے تو بحر بن جائے سراب

چشمِ حکمت میں ہے رقصاں کائنات
چشمِ حکمت سے نمایاں کائنات

دل کہ ہے سر تا بپا سرشارِ علم
دل کہ ہے گنجینۂ بیدارِ علم

بستۂ حق ہو تو پیغمبر ہے وہ
حق سے بیگانہ ہے تو کافر ہے وہ

افغانی : محفلِ ما بے مے و بے ساقی است
ساز قرآن را نواہا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر
آسمان دارد ہزاران زخمہ‌ور

ذکرِ حق از امتان آمد غنی
از زمان و از مکان آمد غنی

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست
احتیاجِ روم و شام او را کجاست

حق اگر از پیشِ ما بردارد‌ش
پیشِ قومے دیگرے بگزاردش

از مسلمان دیده‌ام تقلید و ظن
ہر زمان جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

پیرِ رومی
وہ سراپا جذب و شوق
سن کے یہ فریادِ غم
سر بسر سوز و الم
رو پڑے
پھر مری جانب نظر کی اور کہا
رومی: دل بخوان مثلِ شفق باید زدن
دست در فتراکِ حق باید زدن
جان ز امید است چون جوے روان
ترکِ امید است مرگِ جاودان
ہان بیا، نغمہ بخوان اے زندہ رود
با دو بیتے آتش افگن در وجود
ناقۂ ما خستہ و محمل گران
تلخ تر باید نواے ساربان

نغمہٴ مردے کہ دارد بوے دوست
ملتے را می برد تا کوے دوست

غزل

جو دیکھو تو گل و لالہ مقیم ہیں سارے
روان بصورتِ موج نسیم ہیں سارے
یہاں کوئی نیا نکتہ جنم لیتا
یہاں تو مسجد و مکتب عقیم ہیں سارے
یہ خانقاہ تو ہے سرد ، اپنی آگ میں جل
یہاں تو سوز سے عاری کلیم ہیں سارے
نہ پوچھ حال ہے کیا اپنے تکیہ داروں کا
پریشاں مُو ہیں یہ چرکیں گلیم ہیں سارے
اس ایک کعبے میں کیا کیا حرم بنائے ہیں
کہ سوچ ایک ہے لیکن دو نیم ہیں سارے
نہیں جو بزم میں گرمی تو کوئی بات نہیں
بغیر نقل ہیں سب ، بے ندیم ہیں سارے

فلک زہرہ

[illegible]

[illegible]

غزل

جو دیکھو تو گل و لالہ سقیم ہیں سارے
رواں بصورتِ موجِ نسیم ہیں سارے

یہاں کوئی نیا نکتہ سخن لیتا
یہاں تو [illegible] قدیم ہیں سارے

یہ خانقاہ تو ہے سرد، اپنی آگ میں جل
یہاں تو سوز سے عاری کلیم ہیں سارے

نہ پوچھو حال ہے کیا اپنے تکیہ داروں کا
پریشاں ہو رہے یہ جو کہیں کلیم ہیں سارے

اس ایک کعبے میں کیا کیا حرم بنائے ہیں
کہ سوچ ایک ہے لیکن دو نیم ہیں سارے

جہاں جو نرم دلی گرمی تو کوئی بات نہیں
بظاہر [illegible] سے [illegible] ہیں سارے

راوی : اپنے اس عالمِ خاک اور آفتابِ درخشندہ
کے درمیان جانے کتنی فضائیں
حجابات کے پردے بن کر کھڑی ہیں
اور ان پردوں سے جلوۂ آتشیں
کی شعاعیں
چھنا چھن چلی آ رہی ہیں
تا کہ انسان کے قلبِ کم سوز کا
دیپ جلتا رہے
درد پلتا رہے
اور اسی طرح سے روحِ انسان بھی
اس جہاں سے ابھرتی ہوئی
عالمِ بے جہت ، بے سُوئی کی طرف
لحظہ لحظہ گریزاں چلی جا رہی ہے
راہ میں اس کے مرگ اور حشر
حشر اور مرگ کے مرحلے آتے ہیں
اور چلے جاتے ہیں
سینکڑوں نیلگوں آسماں کی فضاؤں میں وہ
غوطہ زن ہوتی ہے
خود حرم ، خود براہیم ہوتی ہے وہ

خود سراپائے تسلیم ہوتی ہے وہ
اور یہ آسماں یہ بلند آسماں
مثلِ دروازۂ خیبری
اس کے بازوؤں کی ضربت حیدری سے
ہر اک لحظہ تسخیر ہوتے چلے جاتے ہیں
یونہی انسان کی روح مصروف ہے دمبدم
محوِ پرواز بالائے پہنائے نور
اس کے چنگال میں بالِ جبریل و حُور

اقبال : کیا خبر میں کہاں، کس جگہ ہوں
اتنا معلوم نہیں
اپنے ہمراہیوں سے جدا ہوں
میرے سینے میں اک کشمکش ہے بپا
کیسے سمجھے اسے کوئی میرے سوا
آشنائے سفر یاں کوئی دل نہیں
واقفِ راہ، دانائے منزل نہیں
غرقِ دریا ہیں یاں سب صغیر و کبیر
طفل و برنا و پیر

اور ساحل پہ جاں کو سلامت لیے
ایک مردِ فقیر
اپنے سینے میں اک قلبِ مضطر لیے
سربسر آرزو ، سربسر جستجو
ڈھونڈتا ہے نیا اک جہاں کُو بکُو
پیرِ رومی مرے حال سے باخبر
بولے یوں میری بیتابیاں دیکھ کر

پیر رومی: عشق شاطر ، ما بدستش مہرہ ایم
پیش بنگر در سوادِ زہرہ ایم
عالمے از آب و خاک او را قوام
چون حرم اندر غلافِ مشک فام
با نگاہِ پردہ سوز و پردہ‌در
اندرون میغ و ماغِ او گذر
اندرون بینی خدایانِ کہن
می‌شناسم من ہمہ را تن بہ تن
بعل و مردوخ و یعوق و نسر و فسر
رم خن و لات و منات و عسر و غسر

بر قیامِ خویش می آرد دلیل
از مزاجِ این زمانِ بے خلیل

اقبال : وہ ہوائے تند ، وہ شبگوں سحاب
برق بھی ظلمت سے تھی بے آب و تاب
اک تلاطم تھا فضاؤں میں عیاں
ایک دریائے تپان و بے کراں
اس فضائے تیرہ و تاریک میں
تھے مرے ہمراہ پیرِ نیک فال
یوں چلے جاتے تھے دونوں جس طرح
ذہنِ انساں کے شبستاں میں خیال
وہ سفر سے آشنا میں نوسفر
آنکھ میں بے صبر تھی میری نظر
کچھ نظر آتا نہ تھا مجھ کو وہاں
کیا ہے وہ کس طرح کا ہے وہ جہاں
دفعۃً ابھرے نشانِ کوھسار
سامنے تھے جوئبار و مرغزار
کوہ و صحرا تھے بہار اندر بہار
اور خراماں تھی نسیمِ مشکبار

نغمہ زن تھے طائرانِ ہم نفس
رقص میں تھے سبزہ ہائے نیم رس
ایک وادی بے نشیب و بے فراز
آبِ خضر اس خاک پر کرتا تھا ناز
اور اس وادی میں تھے جلوہ فگن
ساری دنیا کے خدایانِ کہن
تھے وہاں ربِ عرب ربِ عراق
اک الہ الوصل اک رب الفراق
یاں خدائے مصر تھا بیٹھا ہوا
واں خدایانِ یمن کا پیشوا
ایک نسلِ مہر دامادِ قمر
اک عروسِ مشتری کا ہم نظر
ایک کے ہاتھوں میں تھی تیغِ دو دم
ایک کی گردن میں مارِ خم بخم
ان میں تھا مردوخ بھی بیٹھا ہوا
ہم کو واں دیکھا تو یوں گویا ہوا

مردوخ : وہ دیکھیے پھر منکرِ یزداں ہوا آدم
پھر دیر سے کعبے سے ، گریزاں ہوا آدم

پھر نشۂ ادراک سے سرشار ہوا وہ
پھر عہدِ گزشتہ کا طلب گار ہوا وہ
لو پھر سے وہ آثارِ کہن کا ہوا قائل
پھر ان کے کرامات کی جانب ہوا مائل
اس عالم خاکی نے نئی چال چلی ہے
اُس دھر سے پھر بُوے مراد آنے لگی ہے

اقبال : دیوتا سن کے افسانے مردوخ کے
فرطِ جوشِ مسرت میں گویا ہوئے

نغمہٴ بعل

حضرت انساں فلک پر جب گیا
واں بھی یزداں کا نشاں کوئی نہ تھا
قلبِ آدم ہے خیالوں کا طلسم
اک کبھی ابھرا ، کبھی اک دب گیا
ہے قرار اُس کو فقط محسوس سے
کاش ہو عہدِ کہن جلوہ نما
زندہ باد افرنگیِ مشرق شناس
تو نے دوبارہ ہمیں زندہ کیا
اے خدایانِ کہن
اب وقت ہے ، اب وقت ہے

ب : حلقۂ وحدت میں پھر آئی شکست
سب براہیمی ہیں بے ذوقِ الست
صحبتیں برہم ہیں ، ساغر پاش پاش
چل بسے وہ میکشانِ خُلد مست
مردِ حُر پھر سے ہے پابندِ جہات
ہے وطن کا دوست وہ یزداں پرست
ہے شکوہِ دیریاں سے سرد خوں
پھر ہوا پیرِ حرم زنار بست
اے خدایانِ کہن
اب وقت ہے ، اب وقت ہے

ج : پھر جہاں میں آئے ایامِ طرب
دین پر غالب ہوئے ملک و نسب
اب چراغِ مصطفیٰ سے خوف کیا
اک چراغ اور سینکڑوں ہیں بولہب
گرچہ آتی ہے صدائے لاالٰہ
دل سے جو جائے کہاں روکیں گے اب
اہرمن جاگا فسونِ غرب سے
روزِ یزداں پر ہے طاری خوفِ شب

اے خدایانِ کہن
اب وقت ہے ، اب وقت ہے

اقبال : ر : اپنا بندہ ، بندۂ آزاد ہے
بندِ دیں سے بھی ہوئی اس کو کشود
ڈھونڈ لاؤ اس نمازی کے لیے
ایک رکعت اور وہ بھی بے سجود
نغموں سے جذبات ہوتے ہیں بلند
دے گی کیا لذت نمازِ بےسرود
دیو بہتر ہے خدائے غیب سے
اس کو حاصل تو ہے دنیائے شہود
اے خدایانِ کہن
اب وقت ہے ، اب وقت ہے

اقبال : پیرِ رومی نے ڈالی نظر اس طرف
اُن کے حسنِ تقدس کی رعنائیوں کی ضیا
جگمگانے لگی
اُن کی آنکھوں کی گویائیوں کے اثر سے فضا
گنگنانے لگی
ہر طرف سے یہ آواز آنے لگی

غزل

روح رومی : باز بر رفته و آینده نظر باید کرد
هله برخیز که اندیشه دگر باید کرد
عشق بر ناقهٔ ایام کشد محمل خویش
عاشقی ، راحله از شام و سحر باید کرد
پیر ما گفت جهان بر روشے محکم نیست
از خوش و ناخوش او قطع نظر باید کرد
تو اگر ترک جہان کرده سر او داری
پس نخستین ز سر خویش گزر باید کرد
گفتمش در دل من لات و منات است بسے
گفت این بتکده را زیر و زبر باید کرد

اقبال : سن کے یہ نغمے خدایان کہن
وجد میں آئے زمیں پر جھک گئے
پیر رومی نے مری جانب نظر کی اور کہا

رومی : رفت هرچه رفت برخیز اے پسر!
جز بدامانم میاویز اے پسر!

آن کہستان ، آن جبالِ بے کلیم
آنکہ از برف است چون انبارِ سیم

در پسِ او قلزمِ الماس گون
آشکاراتر درونش از برون

نے بموج و نے بسیل او را خلل
در مزاجِ او سکونِ لم یزل

این مقامِ سرکشانِ زور مست
منکرانِ غائب و حاضر پرست

آن یکی از شرق و آن دیگر ز غرب
ہر دو با مردانِ حق در حرب و ضرب

آن یکے بر گردنش چوبِ کلیم
وان دگر از تیغِ درویشے دونیم

ہر دو فرعون این صغیر و آن کبیر
ہر دو در آغوشِ دریا تشنہ میر

ہر کسے با تلخیِ مرگ آشناست
مرگِ جباران ز آیاتِ خداست

در پئے من پا بنہ از کس مترس
دست در دستم بدہ از کس مترس

سینۂ دریا چو موسیٰ بر درم
من ترا اندر ضمیرِ او برم

راوی: تہہ سمندر کی تھی، یا اک وادیِ بے رنگ و بو
ظلمتیں، تاریکیاں تھیں توبتو و سوبسو
پیرِ رومی کی زباں پر سورۂ طٰہٰ رواں
زیرِ دریا آگیا اک ماہتاب ضوفشاں
کوہسارِ شستہ و عریاں و سرد
ان میں تھے سرگشتہ و حیران، دو مرد
پہلے رومی کو لگے وہ دیکھنے
پھر لگے اک دوسرے کو دیکھنے
فرطِ حیرت سے کہا فرعون نے
کس طرف سے آگئی یہ جوئے نور
یہ سحر، یہ جلوۂ نور و ظہور

رومی: ہرچہ پنہاں است ازو پیداستے
اصلِ این نور از یدِ بیضاستے

فرعون : آہ میری چشم و ہوشِ کم سواد
آہ میرے تخت و بختِ نامراد
قدرِ عقل و دین کو جانا نہیں
نور کو دیکھا تو پہچانا نہیں
اے جہاں دارو ! مری جانب نظر
اے زیاں کارو ! مری جانب نظر
حیف ہے اس قوم کی تقدیر پر
قبر سے چنتی ہے جو لعل و گہر
یہ جو بت زیبِ عجائب‌خانہ ہے
اک لبِ خاموش کا افسانہ ہے
پردہ‌بردارِ ملوکیت ہے وہ
کورچشموں کے لیے حیرت ہے وہ
آج اگر دیکھوں کلیم اللہ کو
مانگ لوں اس سے دلِ آگاہ کو

مہدی سودانی: خیز اے روحِ عرب بیدار شو
چون نیاگان خالقِ اعصار شو
اے فواد ، اے فیصل ، اے ابن سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود

زنده کن در سینه آن سوزے کہ رفت
در جہان باز آور آن روزے کہ رفت

خاکِ بطحا: خالدے دیگر بزاے
نغمہٴ توحید را دیگر سراے

اے نخیلِ دشتِ تو بالیدہ‌تر
برنہ‌خیزد ز تو فاروقے دگر

اے جہانِ مومنانِ مشک فام
از تو می‌آید مرا بوئے دوام

بر مقامِ خود نیائی تا بکے
استخوانم در یمے نالد چو نے

ساربان یاران بہ یثرب ما بہ نجد
آن حدی کو ناقہ را آرد بوجد

ابر بارید از زمین‌ها سبزہ رست
می شود شاید کہ پائے ناقہ سُست

جانم از دردِ جدائی در نفیر
آن رہے کو سبزہ کم دارد بگیر

ناقہ مستِ سبزہ و من مستِ دوست
او بدستِ تست و من در دستِ دوست

آب را کردند صحرا سلسبیل
بر جبل‌ها شسته اوراقِ نخیل
ریگِ دشت از نم مثالِ پرنیان
جاده بر اشتر نمی‌آید گران
حلقه حلقه چون پرِ تیهو غمام
ترسم از باران که دورم از مقام

فلکِ مریخ

اقبال : بحر کی گہرائیوں میں
ایک لحظہ کے لیے
آنکھ میں نے بند کی
یوں ہوا محسوس جیسے بیخودی سی چھا گئی
میں نے دیکھا کہ آفاق سے
اور ابھرا نیا اک جہاں
اور ہی تھے زمان و مکاں
میں حیران تھا
کیا یہ ہے خلوتِ آسماں؟
یا ہمارا ہی ہے خاکداں
پیرِ رومی نے مجھ سے کہا

رومی : اے کہ حق کردہ ترا صاحب نظر
گفت مریخ است این عالم نگر
چون جہانِ ما طلسم رنگ و بوست
صاحبِ شہر و دیار و کاخ و کوست
ساکنانش چون فرنگان ذو فنون
در علومِ جان و تن از ما فزون

بر زمان و بر مکان قاهرتر اند
زانکه در علمِ فضا ماهرتر اند

خاکیان را دل به بندِ آب و گل
اندرین عالم بدن در بندِ دل

چون دلے در آب و گل منزل کند
هرچه می‌خواهد بآب و گل کند

در جهانِ ما دو تا آمد وجود
جان و تن، آن بے نمود این با نمود

خاکیان را جان و تن مرغ و قفس
فکرِ مریخی یک اندیش است و بس

چون کسے را می‌رسد روزِ فراق
چست تر می‌گردد از سوزِ فراق

یک دو روزے پیشتر از آنِ مرگ
می‌کند پیشِ کسان اعلانِ مرگ

جانِ شان پروردهٔ اندام نیست
لاجرم خو کردهٔ اندام نیست

رخت اینجا یک دو دم باید کشاد
این چنین فرصت خدا کس را نداد

اقبال: میں نے دیکھا کہ اک پیر مرد
علم و حکمت میں فرد
مثلِ دانایانِ غرب
مثلِ ترسایانِ غرب
جانتا تھا رسم و راہِ ہر طریق
آنکھ میں اس کے درخشندہ تھی اک فکرِ عمیق
دیکھ کر انسان کو مریخ میں
اس قدر وہ خوش ہوا
پھول کی مانند گویا کھل گیا
اور زبانِ طوسی و خیام میں گویا ہوا

حکیم مریخی: پیکرِ گل آن اسیرِ چند و چون
از مقامِ تحت و فوق آمد برون
خاک را پرواز بے طیارہ داد
ثابتان را جوہرِ سیّارہ داد
بودہ است اندر زمانِ مصطفیٰ
مردے از مریخیانِ باصفا
بر جہان چشمِ جہان بین را کشاد
دل بہ سیرِ خطۂ آدم نہاد

آنچه دید از مشرق و مغرب نشت
نقشِ او رنگین تر از باغِ بهشت
بوده‌ام من هم بایران و فرنگ
گشته ام در ملکِ نیل و رودِ گنگ
دیده ام امریک و هم ژاپون و چین
بهرِ تحقیقِ فلزاتِ زمین
از شب و روزِ زمین دارم خبر
کرده‌ام اندر بر و بحرش سفر
پیشِ ما هنگامه‌هاے آدم است
گرچه او از کارِ ما نامحرم است

روسی: من زِ افلاکم رفیقِ من زِ خاک
سرخوش و ناخورده از رگهاے تاک
مرد بے پروا و نامش زنده رود
مستیِ او از تماشاے وجود
ما که در شهرِ شما افتاده‌ایم
در جهان و از جهان آزاده ایم
در تلاشِ جلوه‌هاے نو به نو
یک زمان ما را رفیقِ راه شو

حکیم مریخی: این نواحِ مرغدینِ برخیا ست
برخیا نامِ ابوالآبایِ ما ست
فرزمرز آن آمرِ کردار زشت
رفت پیش برخیا اندر بهشت
گفت تو اینجا چسان آسوده‌ای
عمرها محکومِ یزدان بوده‌ای
از مقامِ تو نکوتر عالمی است
پیشِ او جنت بهارِ یکدمی است
آن جهان از هر جهان بالاتر ست
آن جهان از لامکان بالاتر ست
نیست یزدان را ازآن عالم خبر
من ندیدم عالمی آزادتر
نی خدایی در نظامِ او دخیل
نی کتاب و نی رسول و جبریل
نی طوافی، نی سجودی اندرو
نی دعایی نی درودی اندرو
برخیا گفت ای فسون پرداز خیز
نقشِ خود را اندران عالم بریز

تا ابوالآبا فریبِ او نخورد
حق جہانے دیگرے با ما سپرد

اندرین مُلکِ خدا دادے گذر
مرغدین و رسم و آئینش نگر

اقبال : مرغدیں شہرِ حسیں
مرغدیں کی وہ عماراتِ بلند
اللہ! اللہ! وہ مقامِ ارجمند
اور اس شہرِ نگارین کے مکیں
سادہ پوش و خوبرو
خوش کلام و نرم خُو
اُن کے افکار ، ان کے ذہن
سربسر بے درد و سوزِ اِکتساب
آشنائے کیمیائے آفتاب

نور سے کرتے ہیں وہ کسبِ ہنر
نور سے حاصل ہیں اُن کو سیم و زر
علم کا مقصد بجز خدمت نہیں
ان کے کاموں کا صلہ دولت نہیں

ہیں وہاں مفقود دینار و درم
ان بتوں سے ہیں وہاں خالی حرم
طبع پر غالب نہیں دیوِ مشیں
ان فضاؤں میں دھواں اٹھتا نہیں
دہ خداؤں کا نہیں ملتا سراغ
کلبۂ دھقاں میں جلتا ہے چراغ
تلخیِ حرماں نہ فکرِ جستجو
ذکرِ باراں ہے نہ ذکرِ آبجو
کھیت اُس کے اور محنت اُس کی ہے
جو ملے محنت سے دولت، اُس کی ہے
واں نہ محکومی نہ کوئی سرکشی
واں نہ لشکر ہے نہ ہے لشکر کشی
بہرِ روزی کشت و خوں ہوتا نہیں
اس طرح کا واں کوئی جھگڑا نہیں
واں گداؤں کی صدا آتی نہیں
بے نواؤں کا نشاں کوئی نہیں

حکیم مریخ: کس درین جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اقبال : سائل و محروم ہے تقدیرِ حق
حاکم و محکوم ہے تقدیرِ حق
اور خدا خود خالقِ تقدیر ہے
چارۂ تقدیر بے تدبیر ہے

حکیم مریخ : گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر
خواه از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواهی روا ست
زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہا ست
ارضیان نقدِ خودی درباختند
نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمزِ باریکش بحرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذرِ هوا سازد ترا
سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی ؟ افتندگی تقدیرِ تست
قلزمی ؟ پایندگی تقدیرِ تست
می شناسی طبعِ دراک از کجا ست
حورے اندر بنگہِ خاک از کجا ست

گرمیِ گفتار داری از تو نیست
شعلهٔ کردار داری از تو نیست
این همہ فیض از بہارِ فطرت است
فطرت از پروردگارِ فطرت است
بندهٔ کز آب و گل بیرون نجست
شیشهٔ خود را بسنگِ خود شکست
نوعِ دیگر بین ، جہان دیگر شود
این زمین و آسمان دیگر شود

اقبال : ہم گزرتے گئے
ان ہزاروں مقامات و قصر و محلات
سے ہم گزرتے گئے
دفعۃً آ گیا
شہر کے اک طرف
ایک میدان ، پھیلا ہوا دور تک
اور میدان میں
مرد و زن کا ہجوم
اس انبوه میں
ایک نازک بدن

چہرہ روشن مگر نورِ جاں سے تہی
آنکھ بے کیف ، آواز بے سوز سی
نہ لبوں پر ہنسی
نہ کہیں آنسوؤں کی نمی
ایک ڈھانچہ خط و خال کا
ایک بے جان تصویر سی
عشق جس پر نظر بھی نہ ڈالے کبھی
میں حیران ، ششدر کھڑا تھا وہاں
یوں مخاطب ہوا مجھ سے وہ راز داں

حکیم مریخ : هاں ببین اے زنده رود، اے نکته دان
نیست این دوشیزه از مریخیان
ساده و آزاده و بے ریو و رنگ
فرزمرز او را بدزدید از فرنگ
پخته در کارِ نبوت ساختش
اندرین عالم فروانداختش
گفت نازل گشته‌ام از آسمان
دعوتِ من دعوتِ آخر زمان

از مقامِ مرد و زن دارد سخن
فاش‌تر می‌گوید اسرارِ بدن
نزدِ این آخر زمان تقدیر زیست
در زبانِ ارضیان گویم که چیست

نبیهٔ مریخ: ہاں سنو، اے عورتو
اے ماؤں بہنو، ہاں سنو
کس سے سیکھی ہے یہ تم نے دلبری
یہ ادا و ناز یہ عشوہ‌گری
دلبری محکومیوں کا نام ہے
سربسر مظلومیوں کا نام ہے
تم سمجھتی ہو کہ ناز و غمزہ سے
شان سے زلفوں کو لہراتے ہوئے
مرد کے دل کو لبھا لیتی ہو تم
اپنا دیوانہ بنا لیتی ہو تم
اصل میں تم بستۂ زنجیر ہو
مرد ہے صیاد، تم نخچیر ہو
تم کو پابندِ حرم کرتا ہے وہ
مبتلائے درد و غم کرتا ہے وہ

اس کی صحبت میں ہے آزارِ حیات
وصل میں اُس کے نہاں زہرِ ممات
زندگی کی موت ہے اس سے ڈرو
ہے یہی بہتر کہ بے شوہر رہو
ہوتے ہیں اسرارِ تازہ آشکار
ہر زمان اعصارِ تازہ آشکار
پرورش پائے گی اک نوعِ دگر
بے شبِ ارحام دیکھے گی سحر
دہر سے مٹ جائے گا یہ اہرمن
مثلِ حیواناتِ ایامِ کہن
اب نئے گلشن ملیں گے دہر میں
پھول بے شبنم کھلیں گے دہر میں
خود بخود پردے اٹھیں گے راز سے
نغمے بے مضراب اٹھیں گے ساز سے
ابرِ نیساں سے گہر چینی نہ کر
اے صدف دریا کی تہ میں ڈوب مر

رومی : مذہبِ عصرِ نو آئینے نگر
حاصلِ تہذیبِ لادینی نگر

زندگی را شرع و آئین است عشق
اصلِ تہذیب است دین، دین است عشق
ظاہرِ او سوزناک و آتشین
باطنِ اُو نورِ رب العالمیں
از تب و تابِ درونش علم و فن
از جنونِ ذو فنونش علم و فن
دین نگردد پختہ بے آدابِ عشق
دین بگیر از صحبتِ اربابِ عشق

فلکِ مشتری

راوی : کیا عجب اپنا دلِ دیوانہ ہے
ہر گھڑی وحشت نئی ہے
اک نیا جوشِ جنوں
ہر گھڑی ، ہر لحظہ اس کے سامنے
اک نئی صحرا نوردی ، اک نیا ویرانہ ہے
رُک نہیں سکتا کسی منزل پہ یہ
مل نہیں سکتا کہیں ، اس کو قرار
مردِ خود بیں ، مردِ خود رس کے لیے
بحرِ ناپیدا کنار
اک قدم ہے ، ایک گام
اس کی نظروں میں ہیں آیاتِ خدا لاانتہا
راہرو! اس راہ کی کیا انتہا
کارِ حکمت
دیکھنا اور دیکھ کر حیرت میں آ جانے کا نام
کارِ عرفاں
دیکھنا اور دیکھ کر جلوے کو پا جانے کا نام

علم و حکمت ہے ترازوے ہنر
علمِ عرفاں ہے ترازوے نظر

اُس کا حاصل آب و خاک
اِس کا حاصل جانِ پاک
وان تجلی میں نگہ کھوئی ہوئی
یاں تجلی گود میں سوئی ہوئی

اقبال : پیرِ رومی کے طفیل
جس نے میری رُوح کو
ایک سوزِ جاوداں سے بھر دیا
جس نے میری روح کو تڑپا دیا!
دل میں لے کے جلوہ‌ہائے پے بہ پے کی جستجو
میں یونہی چلتا گیا
عالمِ افلاک طے کرتا گیا
وہ تھے میرے رہنما
اور میں تھا مقتدی
دفعتاً
یہ ہمارا مختصر سا قافلہ
چلتے چلتے رک گیا
دیکھتا کیا ہوں کہ میرے سامنے
ہے ہویدا عالمِ چرخِ نوی

نام ہے جس کا جہاں میں مشتری
وہ جہاں ، وہ خاکدانِ نا تمام
اور اس کے گرد سرگرمِ خرام
ماہ ہائے تیزگام
نیم شب اس کی ، مثالِ نیمروز
نہ وہاں خنکی ہواؤں میں نہ سوز
نشۂ مے دور اس کے تاک سے
آرزو آگتی نہیں اس خاک سے
میں نے ڈالی آسماں پر اک نظر
اک ستارہ تھا مرے نزدیک تر
مجھ پہ وہ طاری ہوئی ہیبت نہ پوچھ
میرے قلب و روح کی حالت نہ پوچھ
تین روحیں تھیں نظر کے سامنے
آتشِ سوزاں کو سینے میں لیے
جسم پر ان کے لباسِ لالہ گوں
اور چہروں پر عیاں سوزِ دروں
سر بسر تھے پیکرِ جامِ الست
اپنے نغموں کی طرب ریزی میں مست

مجھ پہ طاری تھی ابھی یہ بے خودی
پیرِ رومی کی صدا آنے لگی

رومی : ہوشیار اے زندہ رود! از خود مرو
از دمِ آتش‌نوایان زندہ شو
شوقِ بے پروا ندید ستی، نگر
زورِ این صہبا ندید ستی، نگر
غالب و حلاج و خاتونِ عجم
شورہا افگندہ در جانِ حرم
این نواہا روح را بخشد حیات
گرمیِ او از درونِ کائنات

اقبال : میری آنکھیں کھل گئیں
روح میں بیداریاں پیدا ہوئیں
میری نظروں سے حجاب اٹھنے لگے
یک بیک
ایک ہیبت سی فضا پر چھا گئی
چرخ گونج اٹھا، زمیں تھرا گئی
یہ صدائے نغمۂ حلاج تھی

نوائے حلاج: ز خاکِ خویش طلب آتشی کہ پیدا نیست
تجلیِ دگرے در خورِ تماشا نیست
نظر بہ خویش چنان بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہان گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست
بملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را
"کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست"
اگر چہ عقلِ فسون پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناس نہ ای و ز مقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمٰی نیست
ز قید و صیدِ نہنگان حکایتے آور
مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
مریدِ ہمتِ آن رہروم کہ پا نگزاشت
بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش
حذر ز بیعتِ پیری کہ مردِ غوغا نیست

اقبال : اللہ اللہ یہ حدیثِ سرمدی
یہ کلامِ دل نشیں

یہ نوائے آتشیں
میں ابھی تھا اس حسین نغمے کی کیفیت میں گم
قلب تھا اس شعلۂ آواز میں کھویا ہوا
غالب نغمہ سرا
شاعرِ آتش نوا
گویا ہوا

نوائے غالب: بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار، نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں، بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں، سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
بجنگ، باج ستانانِ شاخسارے را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بصلح بال فشانانِ صبح گاہی را
ز شاخسار سوے آشیاں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سُوے خاوراں بگردانیم

اقبال : غالبِ نغمہ سرا کی یہ نوا
میرے قلب و روح کو گرما گئی
ذہن میں اک برق سی لہرا گئی
دل پہ تھی اک بیخودی طاری ابھی
طاہرہ کی یہ صدائے سرخوشی
کان میں آنے لگی

نوائے طاہرہ: گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غمِ تُرا ، نکتہ بہ نکتہ ، مُو بہ مُو
از پے دیدنِ رُخت ، ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ ، در بہ در ، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو
می رود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ ، جو بہ جو
مہرِ ترا دلِ حزین ، باختہ بر قماشِ جان
رشتہ بہ رشتہ ، نخ بہ نخ ، تار بہ تار ، پُو بہ پُو
در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندیدہ جز ترا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو

اقبال : سن کے نغمے عاشقانِ زار کے
دل میں اک طوفاں اٹھا
ذہن کے در وا ہوئے
مشکلاتِ کہنہ پھر سے جاگ اٹھیں
پھر پرانی الجھنیں تازہ ہوئیں
میری نظروں میں امڈ آئے خیال
بن گئیں خاموشیاں حرفِ سوال
پیرِ رومی دیکھ کر حالت مری
مجھ سے یوں کہنے لگے

رومی : زود باش و وقت را از کف مده
اے کہ می خواہی کشودِ ہر گرہ
چند در افکارِ خود باشی اسیر
این قیامت را برون ریز از ضمیر

اقبال : سن کے یہ باتیں مجھے جرأت ہوئی
دو قدم آگے بڑھا اور عرض کی
کیوں مقامِ مومنیں سے دور ہوں ؟
یعنی کیوں فردوس سے مہجور ہوں ؟

حلاج : مردِ آزادے کہ داند خوب و زشت
می‌نگنجد روحِ او اندر بہشت
جنتِ مُلا مے و حور و غلام
جنتِ آزادگان سیرِ دوام
جنتِ مُلا خور و خواب و سرود
جنتِ عاشق تماشاے وجود
حشرِ مُلا شقِ قبر و بانگِ صور
عشقِ شور انگیز خود صبحِ نشور
علم بر بیم و رجا دارد اساس
عاشقان را نے امید و نے هراس
علم ترسان از جلالِ کائنات
عشق غرق اندر جمالِ کائنات
علم را بر رفتہ و حاضر نظر
عشق گوید آنچہ می‌آید نگر
عشقِ ما از شکوه‌ها بیگانہ ایست
گرچہ او را گریۂ مستانہ ایست
این دلِ مجبورِ ما مجبور نیست
ناوکِ ما از نگاهِ حور نیست

آتشِ ما را بیفزاید فراق
جانِ ما را سازگار آید فراق
بے خلش‌ها زیستن نازیستن
باید آتش در تہِ پا زیستن
زیستن این گونہ تقدیرِ خودی است
از همین تقدیر تعمیرِ خودی است

اقبال : گردشِ تقدیر سے ہے
موت کا اور زندگی کا ماجرا
گردشِ تقدیر خود کیا چیز ہے
یہ نہیں چلتا پتا

حلاج : ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ
لرزد از نیروے او ابلیس و مرگ
جبر، دینِ مردِ صاحب همت‌است
جبرِ مردان، از کمالِ قوت است
جبرِ خالد عالمے برهم زند
جبرِ ما بیخ و بنِ ما بر کند

تو کہ دانی از مقامِ پیرِ روم
می‌ندانی از کلامِ پیرِ روم

رومی : بود گبرے در زمانِ بایزید
گفت او را یک مسلمانِ سعید
خوشتر آن باشد کہ ایمان آوری
تا بدست آید نجات و سروری
گفت این ایمان اگر هست اے مرید
آنکہ دارد شیخِ عالم ، بایزید ،
من ندارم طاقتِ آن ، تابِ آن
کان فزون آمد ز کوشش هاے جان

حلاج : کارِ ما غیر از امید و بیم نیست
هر کسے را همتِ تسلیم نیست
معنیِ تقدیر کم فهمیده‌ای
نے خودی را ، نے خدا را دیده‌ای
مردِ مومن با خدا دارد نیاز
با تو ما سازیم تو با ما بساز

عزمِ او خلاقِ تقدیرِ حق است
روزِ هیجا تیرِ او تیرِ حق است

اقبال : تنگ نظروں نے کیا فتنہ بپا
بندۂ حق کو اٹھا کر
دار پر کھنچوا دیا

حلاج : بود اندر سینۂ من بانگِ صُور
ملتے دیدم کہ دارد قصدِ گور
مومنان با خو و بوے کافران
لا الہٰ گویان و از خود منکران
امرِ حق ، گفتند نقشِ باطل است
زانکہ او وابستۂ آب و گل است
من بخود افروختم نارِ حیات
مردہ را گفتم ز اسرارِ حیات
از خودی طرحِ جہانے ریختند
دلبری با قاهری آمیختند
هر زمان ، هر دل درین دیرِ کہن
از خودی درپردہ می گوید سخن

هر کہ از نارش نصیبِ خود نبرد
در جہاں از خویشتن بیگانہ مرد

من ز نور و نار او دادم خبر
بندۂ محرم گناہِ من نگر

طائرہ : از گناہِ بندۂ صاحب جنون
کائناتِ تازۂ آید برون

آخر از دار و رسن گیرد نصیب
بر نگردد زندہ از کوے حبیب

جلوۂ او بنگر اندر شہر و دشت
تا نہ پنداری کہ از عالم گزشت

اقبال : میں نے غالب سے کہا
مجھ کو اپنے شعر کے معنی بتا

''قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟''

غالب : وہ نالہ جو سازِ جگر سے اٹھا
ہر اک دل پہ اس کا اثر ہے جدا
اک طرف قمری کو دیکھ
سوزِ الفت میں جلی
ایسی جلی
مشتِ خاکستر بنی
اس طرف ہے عندلیب
عشق کے ، جذبات میں نغمہ سرا
سرخوشی میں چہچہاتی ہے سدا
قمری و بلبل کے دل میں
ہے وہی سوزِ جگر ،
ہاں مگر
اک جگہ سوزِ حیات ، اک جگہ سازِ حیات

تو ندانی این مقامِ رنگ و بوست
قسمتِ ہر دل بقدرِ ہا و ہوست

اقبال : غالبِ نکتہ سرا یہ تو بتا
اس فضائے نیلگونِ چرخ میں

اور بھی آباد ہیں لاکھوں جہاں
لیکن ان میں اپنی دنیا کی طرح
ہوتے ہیں کیا انبیاءؑ و اولیا ؟

غالب : دیکھ یہ ہے عالمِ بود و نبود
ہے یہاں ہر دم جہانوں کی نمود
ہو بپا ہنگامہٴ عالم جہاں
رحمۃُللعالمیں ہوگا وہاں

اقبال : اس طرح یہ نکتہ سمجھا دے مجھے
بات کو پا جائے فہمِ نارسا

غالب : بات جو تو نے کہی بالکل درست
لیکن اس کو فاش کہنا ہے خطا

اقبال : گفتگوے اھلِ دل بے کار ہے ؟

غالب : نکتہ لب پر آئے یہ دشوار ہے

اقبال : تو سراپا شعلۂ آواز ہے
بات پر قابو نہیں کیا راز ہے؟

غالب : خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا
رحمۃللعالمینی انتہا

اقبال : میں نے اب تک راز کو پایا نہیں
چہرۂ معنی نظر آیا نہیں
اس طرح یہ نکتہ سمجھا دے ہمیں
راز کی گرمی سے تڑپا دے ہمیں

غالب : تو بھی ہے آگاہ رازِ شعر سے
بات یہ افزوں ہے سازِ شعر سے
شاعری کو بات کا یارا نہیں
اس کلیمی میں یدِ بیضا نہیں
مجھ سے یہ تیرا تقاضا ہے بجا
ہے مگر اس بات کا کہنا خطا

غالب : کفر ہے یہ ، لب پہ آسکتی نہیں
شاعری میں یہ سما سکتی نہیں

راوی : حیف یہ انسان کی مجبوریاں
فلسفے کی ، شعر کی معذوریاں
شعر تھا ہیبت زدہ
فلسفہ حیرت زدہ
دونوں کی نظریں پڑیں
چہرۂ منصور پر

حلاج : ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آن کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نُورِ مصطفیٰ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

اقبال : گرچہ ایسا پوچھنا بھی ہے خطا
ہاں مگر اک بات تو مجھ کو بتا
آدمی ہے یا کوئی جوہر ہے وہ
نام ہے جس کا محمد مصطفیٰ

حلاج : پیشِ او گیتی جبین فرسوده است
خویش را خود عبده' فرموده است
عبده' از فهمِ تو بالاتر است
ز آنکه او هم آدم و هم جوهر است
جوهرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است و هم ز آدم اقدم است
عبده' صورت‌گرِ تقدیرها
اندرو ویرانه‌ها تعمیرها
عبده' هم جانفزا ، هم جانستان
عبده' هم شیشه ، هم سنگِ گران
عبد دیگر ، عبده' چیزی دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبده' دهراست و دهر از عبده'ست
ما همه رنگیم او بے رنگ و بو ست
عبده' با ابتدا بے انتها است
عبده' را صبح و شامِ ما کجا ست
کس ز سرِ عبده' آگاه نیست
عبده' جز سرِ الاّ الله نیست

لاالہ تیغ و دمِ او عبدہ'

فاش‌تر خواهی بگو هو عبدہ'

عبدہ' چند و چگونِ کائنات

عبدہ' رازِ درونِ کائنات

مدعا پیدا نگردد زین دو بیت

تا نہ بینی از مقامِ مَارَمیتَ

بگذر از گفت و شنود اے زندہ رود

غرق شو اندر وجود اے زندہ رود

اقبال : عشق کیا ہے ؟ اس کا کاروبار کیا

لذتِ دیدار ہے ؟ دیدار کیا

حلاج : معنیِ دیدارِ آن آخر زمان

حکمِ او بر خویشتن کردن روان

در جہان زی چو رسولِ اِنس و جان

تا چُو او باشی قبولِ انس و جان

باز خود را بین، همین دیدارِ اوست

سُنتِ او سرے از اسرارِ اوست

اقبال : کیا ہے دیدارِ خداے ماہ و مہر
کیا ہے دیدارِ خداے نُہ سپہر ؟

حلاج : نقشِ حق اول بجان انداختن
باز اُو را در جہان انداختن

نقشِ جان تا در جہان گردد تمام
می شود دیدارِ حق ، دیدارِ عام

اے خنک مردے کہ از یک ہوے اُو
نہ فلک ، دارد طوافِ کوے اُو

واے درویشے کہ ہوے آفرید
باز لب بربست و دم در خود کشید

حکمِ حق را در جہان جاری نکرد
نانے از جو خورد و کرّاری نکرد

خانقاہے جُست و از خیبر رمید
راہبی ورزید و سلطانی ندید

نقشِ حق داری، جہان نخچیرِ تست
ہم‌عنان تقدیر با تدبیرِ تُست

عصرِ حاضر با تو می‌جوید ستیز
نقشِ حق بر لوحِ این کافر بریز

اقبال : نقشِ حق اس دھر میں ڈالا گیا
پر نہیں معلوم یہ کیسے ھوا

حلاج : یا بزورِ دلبری انداختند
یا بزورِ قاھری انداختند

زانکہ حق در دلبری پیداترست
دلبری از قاھری اولیٰ‌ترست

اقبال : یہ تو بتلا صاحبِ اسرارِ شرق
زاھد و عاشق میں کیا ھوتا ہے فرق

حلاج : زاھد اندر عالمِ دنیا غریب
عاشق اندر عالمِ عقبیٰ غریب

اقبال : معرفت کیا نیستی کا نام ہے ؟
زندگانی کا فنا انجام ہے ؟

حلاج : سکرِ یاران از تہی پیمانگی است
نیستی از معرفت بیگانگی است
اے کہ جوئی در فنا مقصود را
در نمی یابد عدم موجود را

اقبال : اور وہ ہستی کیا جس نے غرور
آدمِ خاکی سے تھا جس کو نفور
اس طرح جو بے سر و ساماں ہوا
جام میں جس کے نہ تلچھٹ تھی نہ مے
ہے ہماری خاک ، گردوں آشنا
اس کے نور و نار کا کیا حال ہے؟

حلاج : کم بگو زآن خواجۂ اہلِ فراق
تشنہ کام و از ازل خونین ایاق

ما جہول او عارفِ بود و نبود
کفرِ او این راز را بر ما کشود

از فتادن لذتِ برخاستن
عیش افزودن ز دردِ کاستن

عاشقی در نارِ او واسوختن
سوختن بےنارِ اُو ناسوختن

زانکہ او درعشق وخدمت اقدم است
آدم از اسرارِ او نامحرم است

چاک کن پیراہنِ تقلید را
تابیاموزی ازو توحید را

اقبال : ہے ترے زیرِ نگیں اقلیمِ جان
ہاں ذرا دو چار باتیں اور ہاں

حلاج : با مقامی در نمی‌سازیم و بس
ما سراپا ذوقِ پروازیم و بس

ہر زمان دیدن، تپیدن کارِ ما ست
بےپر و بالے پریدن کارِ ما ست

راوی : ناگہاں ، یہ جہاں
ظلمتوں میں کھو گیا
اور مکاں سے لامکاں تک
اک شبِ تاریک بن کر سو گیا
دفعۃً
اس شبِ تاریک میں
ایک شعلہ سا اٹھا
اور شعلے میں نہاں اک پیرِ مرد
اک قبائے سرمئی پہنے ہوئے
تھا نظر کے سامنے
پیرِ رومی نے کہا

رومی : کہنۂ کم خندۂ اندک سخن
چشمِ او بینندۂ جان در بدن
رند و مُلا و حکیم و خرقہ پوش
درعمل چون زاہدانِ سخت کوش
فطرتش بیگانۂ ذوقِ وصال
زُہدِ او ترکِ جمالِ لایزال

تا گسستن از جمال آسان نبود
کار پیش افگند از ترکِ سجود
اندکے در وارداتِ او نگر
مشکلاتِ او ثباتِ او نگر
غرق اندر رزمِ خیر و شر ہنوز
صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

راوی : اور پھر اس آگ میں
گونج سی پیدا ہوئی
اک صدا آنے لگی
یونہی بے آواز سی

ابلیس : اس جہانِ کار میں
کس قدر مصروف ہوں
مجھ سا مصروفِ عمل کوئی نہیں
فرصتِ آدینہ بھی ملتی نہیں
نہ کوئی چاکر مرا
نہ ملک میرا نہ پیغمبر مرا

دیکھ میرا حوصلہ
دیکھ میرا معجزہ
بے حدیث و بے کتاب
ان فقیہانِ جہاں سے جانِ شیریں چھین لی
دیکھ ان کی تفرقہ پردازیاں
دیکھ ان کی خوبیِ اطوارِ زشت
ہو گئی تعمیرِ کعبہ خشت خشت
ہے کہاں یہ فتنہ میرے دین کی تاسیس میں
ایسا کوئی تفرقہ ہوتا نہیں
مذہبِ ابلیس میں
تو مرا ظاہر نہ دیکھ
دیکھ میرے باطنی اطوارِ دیکھ
میں وجودِ حق سے انکاری نہیں
میں نے دیکھا ہے اُسے
دیکھنے کے بعد میں کیسے کہوں
خالقِ ارض و سما کوئی نہیں
کس طرح منکر بنوں
یہ مرا دعوائے لا
ہے حقیقت میں بلا

یہ مرا انکار ہی اقرار ہے
میں نے آدم کو دیا
ذوقِ ترک و اختیار
میرے دم سے اس کو مختاری ملی
ہاں مگر
یہ بشر
میرے قید و بند میں
ہو گیا خود ہی اسیر
اور اسی کے فیض سے
بندۂ ناچیز کو
رخصتِ عصیاں ملی
خصلتِ شیطاں ملی
اور اسی کے فیض سے
نامۂ اعمال ہے میرا سیاہ
یہ گناہ اس کا ہے یا میرا گناہ
دفعۃً اس گونج میں
ایک طوفانِ فغاں پیدا ہوا
شور تھا یہ نالۂ ابلیس کا

نالۂ ابلیس: اے خداوندِ صواب و ناصواب
میں ہُوا آدم کی صحبت سے خراب
خود شناسی کی اسے عادت نہیں
مجھ سے ہو سرتاب، یہ ہمت نہیں
سر بسر ذوقِ اِبا سے بےخبر
سوز و سازِ کبریا سے بےخبر
دام کی جانب کھنچا آتا ہے یہ
خود بخود نخچیر بن جاتا ہے یہ
صید اور صیاد کا اتنا اسیر
الاماں یہ بندۂ فرماں پذیر
اس نے مجھ سے چھین لی ہمت مری
مل گئی ہے خاک میں فطرت مری
پھر وہی میرا لہو دے دے مجھے
زندگی کی آبرو دے دے مجھے
میری دیرینہ اطاعت یاد کر
مجھ کو اس نخچیر سے آزاد کر
بندۂ صاحب نظر، مطلوب ہے
اک حریفِ پختہ‌تر مطلوب ہے

آب و گِل کا ہے کھلونا آدمی
اے خدا! یہ کیا بنایا آدمی

ابنِ آدم ہے کہ ابنِ خاک ہے
آدمی مشتِ خس و خاشاک ہے

ابنِ آدم یعنی اس خس کے لیے
کیوں عبث تو نے مجھے شعلے دیے

شیشے کو پگھلادیا تو کیا ہوا
موم پتھر کو کروں تو ہے مزا

بھیج دے ایسا کوئی مردِ خدا
جو یہاں آ کر بنے منکر مرا

اے خدا ایسا کوئی انسان ہو
بندۂ خودسر ہو، نافرمان ہو

جو نہ لائے مجھ کو خاطر میں ذرا
مجھ کو ذرہ بھی نہ سمجھے خاک کا

اپنی نظروں ہی سے لرزا دے مجھے
سامنے آؤں تو ٹھکرا دے مجھے

زندہ و پائندہ مردِ حق پرست
جس کی ہیبت سے میں کھا جاؤں شکست

فلک زحل

لحن سلالة

مشتری کے نظاروں سے فارغ ہوئے
رہ نوردانِ افلاک آگے بڑھے
دور نیلگوں آسماں کی فضاؤں کی پہنائیوں میں کہیں
اک نئی سرزمیں
اک نرالا جہاں تھا عیاں
صبح کے نور سے
مہر کی زرفشاں روشنی سے پرے
شب کی تاریکیوں کا محل
نام اُس کا زحل
آ گیا سامنے
پیرِ رومی نے اقبال کی سمت نظریں اٹھا کر کہا

مولانا روم: بنگر اے گردون نوردِ سخت کوش
دیدہای آن عالمِ زنّار پوش
آنچہ بر گردِ کمر پیچیدہ است
از دمِ استارۂ دزدیدہ است
از گراں سیری خرامِ او سکون
ہر نکو از حکمِ او زشت و زبون

پیکرِ او گرچہ از آب و گل است
بر زمینش پا نهادن مشکل است

صد هزار افرشتۂ تندر بدست
قهرِ حق را قاسم از روزِ الست

ذره پیهم می‌زند سیّاره را
از مدارش بر کَند سیاره را

عالمِ مطرود و مردودِ سپهر
صبحِ او مانندِ شام از بخلِ مهر

منزلِ ارواحِ بے یوم النشور
دوزخ از احراقِ شان آمد نفور

اندرونِ او دو طاغوتِ کهن
روحِ قومے کشته از بهرِ دو تن

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ، ننگِ دین ، ننگِ وطن

ناقبول و ناامید و نامراد
ملّتے از کارِ شان اندر فساد

ملتے کو بندِ ہر ملّت کشاد
ملک و دینش از مقامِ خود فتاد
در جہان تخم غلامی را کہ کشت
این ہمہ کردارِ آن ارواحِ زشت
در فضاے نیلگون یکدم بایست
تا مکافاتِ عمل بینی کہ چیست ؟

اقبال : میں نے کیا دیکھا سنا سکتا نہیں
یہ فسانہ لب پہ آ سکتا نہیں
میں نے کیا دیکھا کہ اک دریاے خوں
ایک طوفاں اندروں ، طوفاں بروں
موجِ خوں جس طرح قلزم میں نہنگ
موجِ خون درنّدہ مانندِ پلنگ
بحر سے ساحل کو کیا ملتی امان
واں تو ساحل بھی تھا اک موجِ روان
ایک کشتی آن سے ٹکراتی ہوئی
ڈگمگاتی اور بل کھاتی ہوئی
اور کشتی میں دو مردِ زرد رو
زرد رو ، عریان بدن ، آشفتہ مو

راوی : آسماں شق ہوا
ایک حورِ زمین ، مہ‌لقا مہ‌جبیں
روے روشن سے پردہ اٹھائے ہوئے
جلوہ افگن ہوئی
تھی جلو میں لیے
سرمدی ناز کی ، نور کی ، اک فضا
اس کی آنکھوں میں سر مستیِ لم‌یزل
اور زیبِ بدن
حلۂ ریشمین
جیسے ابرِ سبک لہلہاتا ہوا
تارِ رگ برگِ گل سے بھی نازک بہت
حسن و خوبی کے با وصف
محکومیوں کے سلاسل میں بند
اس کے لب پر فغاں
اس کا دل دردمند
پیرِ رومی نے دیکھا تو کہنے لگے

مولانا روم : مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش
زخمہء خود کم زند بر تارِ خویش

بر زمانِ رفتہ می‌بندد نظر
از تشِ افسردہ می‌سوزد جگر

بندها بر دست و پاے من ازو ست
نالہ‌هاے نارساے من ازو ست

خویشتن را از خودی پرداختہ
از رسومِ کہنہ زندان ساختہ

آدمیت از وجودش دردمند
عصرِ نو از پاک و ناپاکش نژند

بگزر از فقرے کہ عریانی دهد
اے خنک فقرے کہ سلطانی دهد

الحذر از جبر و هم از خوے صبر
جابر و مجبور را زهر است جبر

این بہ صبرِ پیہمے خوگر شود
آن بہ جبرِ پیہمے خوگر شود

هر دو را ذوقِ ستم گردد فزون
وردِ من یا لیت قومی یعلمون

اقبال : ہے غلامی کا جہاں بھی تذکرہ
ماجرا ہے جعفرِ غدّار کا

گرچہ دنیا میں ہے ہر کافر کی موت
اک فسانہ ہے مگر جعفر کی موت

تن بدن کی قید سے ہو کر رہا
روحِ جعفر زندہ رہتی ہے سدا

اک بدن کو چھوڑ کر جاتا ہے وہ
اک نئے تن میں اُبھر آتا ہے وہ

ہے کبھی نصرانیوں سے سازباز
دھریوں سے ہیں کبھی راز و نیاز

دین اس کا سربسر سوداگری
عنتری لیکن لباسِ حیدری

ہر نئی شے پہ مچل جاتا ہے وہ
ساتھ دنیا کے بدل جاتا ہے وہ

آج اپنا سنگِ در معبود ہے
کل کسی کا آستاں مسجود ہے

بے غمِ دیں سے بظاہر دردمند
باطن اس کا کافرِ زنار بند

چہرہ مومن اور تن ملت فروش
اک مسلمانِ کہن ملت فروش

سانپ کی عادت بدل سکتی نہیں
زہر کی فطرت بدل سکتی نہیں

جو بھی یاں ظالم ہے یا صیاد ہے
جعفر و صادق کی وہ اولاد ہے

زورق نشیں: حیف ہم سے اس قدر بےمہریِ بود و نبود
کچھ نہیں ہم کو میسر ، کیا عدم اور کیا وجود

زندگی نے مشرق و مغرب میں ٹھکرایا ہمیں
موت کا رہبر درِ دوزخ پہ لے آیا ہمیں

اک شرر بھی جعفر و صادق کی قسمت میں نہ تھا
دیکھتے ھی ہم کو دی نارِ جہنم نے صدا

جاؤ جاؤ تم سے تو بہتر خس و خاشاک ہیں
میرے شعلے بھی تم ایسے کافروں سے پاک ہیں

دیکھ کر ہم کو لرز اٹھی فضائے آسماں
دیکھ کر بولی یہ حالِ زار مرگِ ناگہاں

حفظِ جاں اور ھدمِ تن ہر چند میرا کام ہے
اس جہاں میں قاطعِ اعمار میرا نام ہے

کافرِ غدار کی دنیا میں حیثیت ھی کیا
جنسِ ناقص کی ہے اس بازار میں قیمت ھی کیا

کافرِ غدار کو آسودگی ملتی نہیں
زندگی تو زندگی ہے، موت بھی ملتی نہیں

مولانا روم : اے ہوائے تند ، اے دریائے خون
اے زمین! اے آسمانِ نیلگوں

اے نجوم! اے ماھتاب! اے آفتاب
اے قلم ، اے لوحِ محفوظ ، اے کتاب

اے بتانِ ابیض ، اے لردان غرب
اے جہانے در بغل بے حرب و ضرب

این جہان بےابتدا بےانتہا ست
بندۂ غدّار را مولا کجا ست

راوی : ناگہاں آئی صدائے ہولناک
سینۂ صحرا و دریا
درد سے تھا چاک چاک
دفعۃً
ربطِ اقلیم بدن جاتا رہا
ٹوٹ کر شیرازۂ ہستی بکھرنے لگ گیا
گوشہ گوشہ رعشہ براندام تھا
ذرہ ذرہ درہم و برہم ہوا
دھجیاں کہسار کی اڑنے لگیں
اور چٹانوں پر چٹانیں آ گریں
وادی و میدان و دشت و مرغزار
یوں ہوئے پراں ہوا کے دوش پر
جس طرح طوفاں میں ابرِ مست بار
لڑکھڑاتا ہو فضا میں ہر طرف
اک قیامت تھی بپا
بے صدا
بے بانگِ صور
ابر و برق و رعد و تندر کو کہیں
گوشۂ امن و اماں ملتا نہ تھا

ڈھونڈتے تھے آشیاں ملتا نہ تھا
آخر اس طوفانِ خوں آشام میں
غرق ہو کر رہ گئے کوہ و کمر
اور ستاروں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں

ماورائے افلاک

جانے اس نیلگوں آسماں کی فضاؤں میں
پوشیدہ کیا راز ہے
جس طرف بھی نظر ڈالیے
نیست و ہست کی کشمکش ہے عیاں
ہر جگہ
زندگی صورتِ باد برباد ہے
بے ثبات اور پھر
سربسر آرزوے ثبات
اور اس عالمِ شش جہت سے پرے
اور ہے اک جہاں
اک نئی سرزمین
اک نیا آسماں
ماہ و پرویں نئے
رسم و آئیں نئے
وقت کی رو وہاں
مثلِ تندر رواں
سال اپنا وہاں ایک لمحے سے کم
عقلِ انساں یہاں ، دیدہ ور ، ذوفنوں
اور وھاں زار و خوار و زبوں

اقبال: ہم حدِ کائنات سے گزرے
عالمِ شش جہات سے گزرے

اک نئی کائنات میں پہنچے
عالمِ بے جہات میں پہنچے

رنگِ لیل و نہار سے آزاد
گردشِ روزگار سے آزاد

ہر طرف چھا رہی تھی خاموشی
دفعۃً اک صدائے درد اٹھی

نہ جبریلے نہ فردوسے، نہ حورے نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می‌سوزد ز جانِ آرزومندے

اقبال: میں نے پوچھا یہ کیا ہے افسانہ
کس قدر شوخ ہے یہ دیوانہ

رومی: تو نمی دانی کہ این دیوانہ کیست؟
نیطشے فرزانۂ المانوی است

درمیانِ این دو عالم جاے او ست
نغمۂ دیرینه اندر ناے او ست

باز این حلاجِ بے دار و رسن
نوعِ دیگر گفته آن حرفِ کہن

حرفِ او بیباک و افکارش عظیم
غربیان از تیغِ گفتارش دو نیم

ہم‌نشیں بر جذبۂ او بے نبرد
بندۂ مجذوب را مجنون شمرد

مردِ ره دانے نبود اندر فرنگ
پس فزوں شد نغمه اش از تارِ چنگ

راهرو را کس نشان از ره نداد
صد خلل در وارداتِ او فتاد

نقد بود و کس عیار او را نکرد
کاردانے مردِ کار او را نکرد

عاشقے در آهِ خود گم گشتۂ
سالکے در راهِ خود گم گشتۂ

مستیِ او بر زجاجے را شکست
از خدا ببرید و هم از خود گسست

او بہ لا درماند و تا الا نرفت
از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت

با تجلی ہمکنار و بے خبر
دورتر چون میوہ از بیخِ شجر

چشمِ او جز رویتِ آدم نخواست
نعرۂ بےباکانہ زد آدم کجا ست

ورنہ اُو از خاکیاں بیزار بود
مثلِ موسیٰ طالبِ دیدار بود

پیش نہ گامے کہ آمد آن مقام
کاندرو بےحرف می‌روید کلام

اقبال: سر زمینِ جنت الماویٰ تھی وہ
جلوہ گاہِ عالمِ بالا تھی وہ

ہر گھڑی تھی اک نئی دنیا وہاں
ہر زماں تھا اک نیا عالم عیاں

ہر زماں اس کا نیا رنگِ کمال
ہر زماں اس کا نیا حسن و جمال

اک جہاں تھا سر بسر نور و حضور
غیب بھی تھا واں سراپاے ظہور

ہر طرف نظارہ‌ہاے دل‌نشیں
ہر طرف لرزاں ہوائیں عنبریں

پھول رقصاں دامنِ کہسار میں
حسن کی نہریں رواں گلزار میں

خیمہ ھاے لعل کے زریں طناب
نازنیں حوروں کے چہرے بےنقاب

دیکھ کر فردوس کی رنگیں فضا
میں سراپا نقشِ حیرت بن گیا

آپ نے دیکھی جو محویت مری
پیرِ رومی نے مجھے آواز دی

رومی: اے اسیرِ حلقۂ وہم و قیاس
درگزر از اعتباراتِ حواس

از تجلی کارھاے خوب و زشت
می شود آن دوزخ ، این گردد بہشت

این که بینی قصرهاے رنگ رنگ
اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ

آنچه خوانی کوثر و غلمان و حور
جلوۂ این عالمِ جذب و سرور

زندگی این جا ز دیدار است و بس
ذوقِ دیدار است و گفتار است و بس

اقبال: میں نے دیکھا ایک قصرِ لعل ناب
حسن سے شرمائے جس کے آفتاب

تھے در و دیوار یکسر ضوفشاں
اور دروازے پہ حوریں پاسباں

میں نے پوچھا صاحبِ منزل ہے کون؟
پردہ دارِ جلوۂ محمل ہے کون

رومی: ہان ببین کاشانۂ شرف النسا ست
مرغِ بامش با ملائک ہم‌نوا ست

قلزمِ ما این چنین گوهر نزاد
هیچ مادر این چنین دختر نزاد
خاکِ لاهور از مزارش آسمان
کس نداند رازِ او را در جهان
آن سراپا ذوق و شوق و درد و داغ
حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
آن فروغِ دودۂ عبدالصمد
فقرِ او نقشے کہ ماند تا ابد
تا ز قرآن پاک می‌سوزد وجود
از تلاوت یک نفس فارغ نبود
در کمر تیغِ دو رو ، قرآن بدست
تن بدن هوش و حواس الله مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز
اے خوش آن عمرے کہ رفت اندر نیاز
بر لبِ او چون دمِ آخر رسید
سوے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر
سوے این شمشیر و این قرآن نگر

این دو قوت حافظِ یک دیگرند
کائناتِ زندگی را محور اند
وقتِ رخصت با تو دارم این سخن
تیغ و قرآن را جدا از من مکن

اقبال : یہ صدا دل کو مرے تڑپا گئی
سرزمین پنجاب کی یاد آگئی
یاد یارانِ کہن آئے مجھے
خلد میں بھی درد و غم حاصل ہوئے
اک فغاں سی موجِ کوثر سے اٹھی
اک صدائے دردمند آنے لگی

غنی : جمع کردم مشتِ خاشاکے کہ سوزم خویش را
(پس منظر میں) گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں

رومی : شاعرِ رنگیں نوا طاہر غنی
فقرِ او باطن غنی ظاہر غنی
نغمۂ می‌خواند آن مستِ مدام
در حضورِ سیدِ والا مقام

سید السادات سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ امم

تا غزالی درسِ الله هو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت

مرشدِ آن کشورِ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطین را مشیر

خطہ را آن شاہِ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دین

آفرین آن مردِ ایرانِ صغیر
با ہنرہاے غریب و دل پزیر

یک نگاہِ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہے بدہ

اقبال: کہا میں نے سالارِ ایراں ہیں آپ
عجم میں بھی معمارِ ایماں ہیں آپ

یہ فرمائیے سرِ یزداں ہے کیا
یہ کیوں اس نے شیطاں کو پیدا کیا

اِدھر ہم کو نیکی کی تلقین کی
ادھر شر کو جذب و کشش بخش دی
یہ تقدیر کی بےنیازی ہے کیا
یہ فطرت کی افسوں طرازی ہے کیا

شاہ ہمدان : بندۂ کز خویشتن دارد خبر
آفریند منفعت را از ضرر
بزم با دیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال
خویش را بر اھرمن باید زدن
تو ھمہ تیغ ، آن ھمہ سنگِ فسن
تیز تر شو تا فتد ضربِ تو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

اقبال : میں ابھی اس بات میں ہی محو تھا
آپ اپنی ذات ہی میں محو تھا
ایک دیوانہ وھاں پر آ گیا
اس طرح سے بات کی تڑپا گیا

دیوانہ : بگزر ز ما و نالۂ مستانۂ مجوے
بگزر ز شاخِ گل کہ طلسمے است رنگ و بوے
گفتی کہ شبنم از ورقِ لالہ می‌چکد
غافل دلے است این کہ بگرید کنارِ جوے
این مشتِ پر کجا و سرود این چنین کجا
روحِ غنی است ماتمیِ مرگِ آرزوے
بادِ صبا اگر بہ جینوا گزر کنی
حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام بازگوے
دہقان و کشت و جوے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزان فروختند

اقبال : میں ابھی تھا محوِ حیرت سربسر
بول اٹھے سیدِ والا گہر

شاہ ہمدان: با تو گویم رمزِ باریک اے پسر
تن ہمہ خاک است و جان والا گہر
جسم را از بہرِ جان باید گداخت
پاک را از خاک می‌باید شناخت

گر ببری پارهٔ تن را ز تن
رفت از دستِ تو آن لختِ بدن
لیکن آن جانے کہ گردد جلوه مست
گر ز دست او را دهی ، آید بدست
چیست جان دادن ؟ بحق پرداختن
کوه را با سوزِ جان بگداختن
جلوه مستی ؟ خویش را دریافتن
در شبان چون کوکبے برتافتن
خویش را نایافتن، نابودن است
یافتن ، خود را بخود بخشودن است
هر کہ خود را دید ، غیر از خود ندید
رخت از زندانِ خود بیرون کشید
جلوه بدمستے کہ بیند خویش را
خوشتر از نوشینہ داند نیش را
در نگاهش جان چو باد ارزان شود
پیشِ او زندانِ او لرزان شود

تیشهٔ او خارهٔ را می درد
تا نصیبِ خود ز گیتی می‌برد

تا ز جان بگذشت، جانش جانِ او ست
ورنه جانش یک دو دم مهمانِ او ست

اقبال : مرشدِ معنی نگاہاں آپ ہیں
محرمِ اسرارِ شاہاں آپ ہیں

ہم فقیر اور حکمراں مانگے خراج
چیز کیا ہے اقتدارِ تخت و تاج

شاہ ہمدان : اصلِ شاہی چیست اندر شرق و غرب
یا رضاے امتان یا حرب و ضرب ؟

فاش گویم با تو اے والا مقام
باج را جز با دو کس دادن حرام

یا اولی‌الامرے که منکم شانِ او ست
آیهٔ حق حجّت و برهانِ او ست

یا جوان مردے چو صرصر تندخیز
شہرگیر و خویش باز اندر ستیز
روزِ کیں کشورکشا از قاہری
روزِ صلح از شیوہ‌ہاے دلبری
جامِ جم را اے جوانِ باہنر
کس نگیرد از دکانِ شیشہ‌گر
ور بگیرد مالِ او جز شیشہ نیست
شیشہ را غیر از شکستن پیشہ نیست

اقبال: سن کے یہ طاہر غنی گویا ہوئے
بات اپنے رنگ میں کہنے لگے

غنی: ہیچ می‌دانی کہ روزے در ولر
موجۂ می‌گفت با موجِ دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم
خیز تا یک دم بساحل سر زنیم
زادۂ ما یعنی آن جوے کہن
شورِ او در وادی و کوہ و دمن

ہر زمان بر سنگِ رہ خود را زند
تا بنائے کوہ را برمی کند
زیستن اندر حدِ ساحل خطا ست
ساحلِ ما سنگے اندر راہِ ما ست
با کران در ساختن مرگِ دوام
گرچہ اندر بحر غلطی صبح و شام
زندگی جولان میانِ کوہ و دشت
اے خنک موجے کہ از ساحل گذشت
اے کہ خواندی خطِ سیمائے حیات
اے بہ خاور دادہ غوغائے حیات
اے ترا آہے کہ می‌سوزد جگر
تو ازو بےتاب و ما بےتاب‌تر
کاروان‌ها را صدائے تو درا
تو ز اہلِ خطہ نومیدی چرا ؟
دل میانِ سینۂ شان مردہ نیست
اخگرِ شان زیرِ یخ افسردہ نیست
باش تا بینی کہ بےآوازِ صور
ملتے برخیزد از خاکِ قبور

غم مخور اے بندۂ صاحب نظر
برکش آن آہے کہ سوزد خشک و تر

پردۂ تو از نواے شاعری است
آنچہ گوی ماوراے شاعری است

تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

اقبال: با نشّۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چون پختہ شوی، خود را بر سلطنت جم زن

گفتند جہان ما آیا بتو می‌سازد ؟
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برهم زن

اے لالۂ صحرائی تنہا نتوانی سوخت
این داغ جگرتابے بر سینۂ آدم زن

تو سوز درون او، تو گرمی خون او
باور نکنی، چاکے در پیکر عالم زن

عقل است چراغ تو؟ در راهگزارے نہ
عشق است ایاغ تو با بندۂ محرم زن

اقبال : وہ گونج اٹھی میری نوا خلد میں
فضائے الم چھا گئی خلد میں
وہ قصر اور محل اور وہ خیمے کھلے
دریچوں سے حوریں لگیں جھانکنے
تڑپنے لگے یوں فلک کے مکیں
کہ جیسے ہوں وہ ساکنانِ زمیں
مرے پاس ہی رومیِ پاک تھے
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے
تجھے شاعری کا ہے دعویٰ بہت
تری ساحری کا ہے چرچا بہت
ادھر دیکھ یہ ہیں ہری بھرتری
کہ ہے شاعری جن کی جادوگری
ابھرتا ہے کیا سوز سے ساز سن
تڑپتے ہوئے دل کی آواز سن

بھرتری ہری :
یہ سب مورتیاں بنتی ہیں پتھر چونے گالے سے
ایک جنا اونچا رہتا ہے مندر اور شوالے سے

پوجا پاٹھ کا پیڑ ہرا نہیں ، پھول اور پھل کیا لائے گا
چاہے بھلا ہو ، چاہے برا ہو ، یہ جیون ہے چالے سے

کوئی نہ جانے ، کوئی نہ سمجھے ، بیچ کھیت میں کہتا ہوں
وہی بھلا ہے جس نے لکھا دل پر شبد اجالے سے

یہ دنیا جو دیکھتے ہو تم ، پرمیشر کا کام نہیں
چرخا تجھ سے اور وہ دھاگا جو پھرتا ہے مالے سے

اپنی شکتی کے گن گاؤ کرم کے آگے سیس نواؤ
سورگ نرک پاتال سبھی کچھ نکلیں شکتی والے سے

اقبال: محوِ حیرت کر گئی مجھ کو نوائے بھرتری
روح میں میرے اتر آئی صدائے بھرتری
جانے کیا جادو تھا اس کی شوخیِ گفتار میں
کھو گیا تھا سربسر میں ، عالمِ افکار میں
اک سراپا خواب کی دنیا تھی میرے سامنے
پیرِ رومی دیکھ کر حالت مری کہنے لگے

رومی: اے مسافر چشمِ دل بیدرا بہ
پا برون از حلقۂ افکار نہ

کردہ ای بر بزمِ درویشان گذر
یک نظر کاخِ سلاطین هم نگر

خسروانِ مشرق اندر انجمن
سطوتِ ایران و افغان و دکن

نادر، آن دانائے رمزِ اتّحاد
با مسلمان داد پیغامِ وداد

مردِ ابدالی وجودش آیتے
داد افغان را اساسِ ملتے

آن شہیدانِ محبت را امام
آبروئے ہند و چین و روم و شام

نامش از خورشید و مہ تابندہ‌تر
خاکِ قبرش، از من و تو زندہ‌تر

اقبال: فکر میرا نا تمام
میرے حرف و صوت، خام
کس طرح تجھ سے کہوں
کیا حسین تھا وہ مقام
ایک قصرِ سربلند

نیلم اور فیروزہ کے دیوار و در
یہ فلک ، یہ آسمانِ نیلگوں
اس کے صحنِ دلکشا کی وسعتوں میں سرنگوں
وہ گل و سرو و سمن ، وہ شاخسار
کھنچ گئی ہو جیسے تصویرِ بہار
ہر کلی ، ہر پھول ، ہر برگِ شجر
ہر گھڑی تھا اک نئے ذوقِ نمو سے تازہ تر
ہر طرف فوارہ ہائے پر خروش
قطرہ قطرہ جن کا تھا گوہر فروش
اس محل کے وسط میں اک بارگاہِ زرنگار
ذرہ ذرہ جس کا تھا اک آفتاب اندر کنار
ہر طرف حوریں قطار اندر قطار
پیکرانِ خدمت و تصویرِ کار
درمیاں میں زرّیں تخت و مسندِ اورنگ پر
خسروانِ جم حشم ، بہرام فر
نادر ، ابدالی و سلطانِ شہید
شانِ شاہی میں تھے تینوں جلوہ گر
حضرتِ رومی مری جانب بڑھے

پھر سوے نادر گئے، کہنے لگے

رومی: بین که این کس، شاعرے از خاور است
شاعرے یا ساحرے از خاور است
فکرِ او باریک و جانش دردمند
شعرِ او در خاوران سوزے فگند

اقبال: پیرِ رومی کا بیانِ سحر کار
سن کے بولے نادرِ عالی وقار

نادر: خوش بیا اے نکتہ سنجِ خاوری
اے کہ می‌زیبد ترا حرفِ دری
محرمِ رازیم، با ما راز گوے
آنچہ می‌دانی ز ایران، باز گوے

اقبال: کیا کہوں یہ سرزمیں ایران کی
بعد مدت کے کھلی ہے اس کی آنکھ
پھر بھی اپنے آپ سے پوشیدہ ہے

پیکرِ مشتاق و حسنِ نظر
خالقِ تہذیب و دانش ہے مگر
مغربی تقلید کی گرویدہ ہے
وارداتِ زندگانی سے تہی
ڈھونڈتی ہے کہنہ قبروں سے سراغِ زندگی
جوہرِ ہستی سے اپنی بے خبر
حیدرِ خیبر شکن کو چھوڑ کر
رستمِ دستاں کی ہے دریوزہ گر
نقشِ باطل لے اڑی افرنگ سے
سرگذشت اپنی سنی افرنگ سے

راوی: دفعتاً
شاعرِ ایران زمیں
ناصرِ خسرو، حکیمِ نکتہ داں
دور سے
یوں ہوئے نغمہ سرا
(روح ناصر خسرو مستانہ وار غزل سرا ہوتی ہے
اور پھر غائب ہو جاتی ہے)

دست را چون مرکبِ تیغ و قلم کردی مدار
هیچ غم گر مرکبِ تن لنگ باشد یا عدن

از سرِ شمشیر و از نوکِ قلم زاید هنر
اے برادر همچو نور از نار و نار از نارون

بےہنر دان نزدِ بےدین هم قلم ، هم تیغ را
چون نباشد دین ، نباشد کلک و آهن را ثمن

دین گرامی شد بدانا و بنادان خوار شد
پیشِ نادان دین چو پیشِ گاو باشد یاسمن

همچو کرپاسے کہ از یک نیمہ زو الیاس وار
کرتہ آید ، وز دگر نیمہ یہودی را کفن

اقبال : اس جہاں میں
امتیں جوشِ اخوت سے ہیں سرگرمِ عمل
اور یاں بھائی سے بھائی برسرِ پیکار ہے
یہ وہ افغاں ہے
کہ جس کی زندگی
سرزمینِ شرق کی ہے زندگی

طفلِ دہ سالہ بھی ہے جس قوم کا
آشنائے شیوۂ لشکر گری
بے خبر ہے آج اپنے آپ سے
کیا خبر اس کو
کہ اس کی ذات میں
کتنے پوشیدہ ہیں
اس کی قوتوں کے ممکنات

تن کی تن سے دل کی دل سے ربط آرائی نہیں
دل تو رکھتا ہے مگر دل سے شناسائی نہیں

اقبال: شاہ ابدالی نے پھر کھولی زباں

ابدالی: آسیا یک پیکرِ آب و گل است
ملتِ افغان در آن پیکر دل است
از فسادِ او فسادِ آسیا
در کشادِ او کشادِ آسیا
تا دل آزاد است، آزاد است تن
ورنہ کاہے در رہِ باد است تن

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمین آتش چراغش روشن است
علم و فن را اے جوانِ شوخ وشنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ دراکے اگر داری بس است

اقبال: میں نے پھر دیکھا کہ سلطانِ شہید
شہریارِ ذی حشم
صاحبِ تیغ و قلم
تاجدارِ باھنر، فرمانروائے، مرز میسور و دکن
دشمنِ جانِ فرنگ
شعلۂ اندر نیستانِ فرنگ
اک نگاہِ لطف سے دیکھا مجھے
اور فرمانے لگے

سلطان شہید: اے جہانِ شعر کے پروردگار
حق نے بخشا ہے تجھے سوزِ دروں
دولتِ سحر و فسوں
تو نے دیکھے ہیں مرے شہر و دیار
تر ہے اشکوں سے ترے اب تک مرا لوحِ مزار
یاد ہے مجھ کو مرا پیارا وطن
اپنی اس جادو بھری آواز میں
اپنے اس اندازِ سوز و ساز میں
جا مرے پیارے وطن کو دے سلام
رودِ کاویری کو دے میرا پیام
اپنی اس جادو بھری آواز میں
اپنے اس اندازِ سوز و ساز میں
تو بھی زندہ رود ، وہ بھی زندہ رود
ایک نغمہ ہے وصالِ دو سرود

اقبال: یہ الفاظ سلطانِ ذی جاہ کے
مرے کانوں میں پہنچے ہی تھے
دفعۃً
دیکھتا کیا ہوں

آواز میری میرے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر
فضا میں مچلنے لگی
ارتعاشِ حسیں بن کے نغموں کے قالب میں ڈھلنے لگی
کیسا پیغام تھا !
میں کہ قاصد تھا
میرے لبوں تک بھی آیا نہ تھا
میرے کانوں نے لیکن اسے سن لیا
رودِ کاویری ذرا آہستہ چل
مدتوں سے تو ہے سرگرمِ سفر
یہ ترا عزمِ سفر
یہ تری رفتارِ تیز
یہ تلاش و جستجو
خستہ ہو جائے نہ تو
رودِ کاویری ذرا آہستہ چل
جانے اس کہسار میں
کتنی صدیوں سے ہے تو
سر کے بل چلتی رہی

اپنی پلکوں سے ہے تو
راستے بنتی رہی
میرے جیحون و فرات
تیری موجِ آب
دکن کے لیے آبِ حیات
کہنہ ہونے پر بھی ہے تیرا وہی رنگِ شباب
ہیں وہی اب تک ترے
پیچ و تاب و رنگ و آب
دے رہا ہوں میں تجھے اس کا پیام
جس کی شوکت کا ہے تو آئینہ دار
جس کی سطوت کا کیا تو نے طواف
جس کی تدبیروں سے صحرا
رو کشِ باغِ بہشت
جس نے اپنے خون سے
تیری پیشانی پہ لکھی
آپ اپنی سرگذشت
یہ تری لہروں کا جوش

یہ تلاطم ، یہ خروش
سب اسی کے خون کی گرمی سے ہے
عالم گفتار جس کا سربسر کردار تھا
نیند میں تھا غرق مشرق اور وہ بیدار تھا

اقبال : کیا مری زندگی ، کیا تری زندگی
سطحِ ہستی پہ اک لہر ابھری ہوئی
ہر نفس اک نئی کائنات
لحظہ لحظہ نیا انقلاب
زندگی ہر گھڑی
ڈھونڈتی ہے یونہی
ایک دنیائے نو کا سراغ
ہے یہاں ہر وجود
نیست و ہست کا تار و پود
ہے یہی اس کا ذوقِ نمود
زندگانی کے سب رہگذر
رہروؤں کی طرح کر رہے ہیں سفر

ہاں مگر
چشمِ انساں ہے کوتہ نظر
وہ سمجھتی ہے جس کو حضر
ہے سفر سربسر
وادی و کوہسار
ریگ و صحرا و دشت و نخیل
ناقہ و محمل و ساربان
جادہ و کارواں
ہر زماں ہے ، رواں
دل میں ذوقِ سفر
لب پہ فریادِ دردِ رحیل
اور صحنِ چمن میں
یہ کلیاں چٹکتی ہوئیں
مسکراتے ہوئے پھول
سب کے سب
ایک لمحے کے ہیں مہماں
ان کی یہ آب و تاب

ان کے یہ رنگ و بو
ذوقِ نظّارہ کا ایک خوابِ حسین
موسمِ گل ہے کیا
عشرتِ نوبہاراں ہے کیا
صحبتِ نا و نوش
حسرتِ نا و نوش
غنچہ ، آغوش میں
نعشِ گل کو اٹھائے ہوئے دوش پر ،
یہ وجود و نمود اور کچھ بھی نہیں
چند محرومیوں ، حسرتوں کے سوا
کیا مری زندگی!
کیا تری زندگی!

اقبال : میں حیران تھا
سخت حیران تھا
میرا پیمانۂ ضبط و صبر و سکوں ٹوٹ کر
ریزہ ریزہ ہوا

پیرِ رومی کی جانب بڑھا
میں نے دیکھا
ان کے ایوانِ عالی کی درگاہ میں
ایک انبوہ حوروں کا تھا
دیکھتے ہی مجھے بول اٹھیں

حوریں : زندہ رود ۔ اے زندہ رود ۔ اے زندہ رود
زندہ رود ! اے صاحبِ سوز و سرود
شور و غوغا از یسار و از یمیں
یک دو دم با ما نشیں ، با ما نشیں
شیوہ ها داری مثالِ روزگار
یک نوائے خوش دریغ از ما مدار

اقبال : سن کے حوروں کی یہ التجائے حسیں
میرے لب پر یہ نظمِ حسیں آ گئی

اقبال : تجھے آدم نہیں ملتا ، خدا کی جستجو کیسی
تو بیگانہ ہے اپنا ، آشنا کی جستجو کیسی

لپٹ جا پھر کسی شاخِ گل و لالہ کے دامن سے
پریدہ رنگ کو بادِ صبا کی جستجو کیسی

یہ مشکِ ناب تیرے خونِ دل کا ایک قطرہ ہے
پھر آھوے حرم دشتِ خطا کی جستجو کیسی

جہانگیری و سلطانی سے شوکت ہے فقیری کی
سریرِ جم طلب کر بوریا کی جستجو کیسی

جہاں بینی کرامت ہے ھماری ، ہم قلندر ہیں
نگہ ہم سے طلب کر ، کیمیا کی جستجو کیسی